وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ

سورۂ فاتحہ

اور

تعمیرِ شخصیّت

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلی کیشنز
۳۶۵/ایم ماڈل ٹاؤن لاہور

نام کتاب	سورہ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
تصنیف	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
نظر ثانی	مفتی عبد القیوم خان
پروف ریڈنگ	محمد رفیق حبیب
اشاریہ	عبدالستار منہاجین
کمپوزنگ	محمد یامین، محمد فیاض
اشاعت اول	دسمبر ۱۹۸۲ء
اشاعت دوم	جنوری ۱۹۸۴ء
اشاعت سوم	نومبر ۱۹۸۴ء
اشاعت چہارم	جولائی ۱۹۸۶ء
اشاعت پنجم	فروری ۱۹۸۷ء
اشاعت ششم	اگست ۱۹۸۷ء
اشاعت ہفتم	مارچ ۱۹۹۱ء
اشاعت ہشتم	جولائی ۱۹۹۸ء (گیارہ سو)
اشاعت نہم	ستمبر ۹۹ء (گیارہ سو)
قیمت	۱۳۰ روپے
مطبع	منہاج القرآن پرنٹرز

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی تمام تصانیف اور خطبات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

ڈائریکٹر پریس اینڈ پبلیکیشنز

بسم الله الرحمن الرحيم

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبرایس او (پی-۱) ۴-۱/۸۰ پی آئی وی مورخہ ۳۱ جولائی ۸۴' گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ ای جنرل وایم ۴/۷۰/۹-۳-۷۷ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء' شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷-۷ این-۱/۱ اے ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر مظفر آباد کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ / ۶۳-۸۰۶۱ / ۹۲ مورخہ ۲ جون ۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

عصر حاضر میں امت مسلمہ جن پیچیدہ سیاسی' معاشی' تہذیبی' معاشرتی اور روحانی مسائل کا شکار ہے اور روز بروز ان مسائل میں وسعت و تنوع پیدا ہوتا جا رہا ہے' اس کا بنیادی سبب قرآنی تعلیمات سے ہمارا عملاً اغماض ہے۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنی فکری و نظریاتی الجھنیں اور سستی جذباتیت کے فتنے سر اٹھا رہے ہیں وہ بھی اسی وجہ سے ہیں کہ بحیثیت قوم ہم اپنے اصل منشور یعنی "قرآن" سے رہنمائی نہیں لیتے۔ اگر امت مسلمہ پھر سے غالب و فائق قوم کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھر کر اپنی عظمت رفتہ بحال کرنا چاہتی ہے تو اسے بہر صورت قرآن کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ بقول حکیم الامت":۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

بانی و قائد تحریک منہاج القرآن پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ کی شبانہ روز مصروفیات سے بھرپور زندگی کے بیشتر اوقات تعلیمات قرآنی کے ابلاغ کے لئے وقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کا ایسا عدیم النظیر فہم اور منفرد انداز بیاں عطا کر رکھا ہے کہ جس آیت کو جتنی بار بھی موضوع سخن بنائیں ہر بار حقائق و معارف کی دلکش لڑیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔ آپ نے تحریک منہاج القرآن کی پوری عمارت کو جن پانچ بنیادی ستونوں پر استوار کیا ہے ان میں تعلق باللہ اور ربط رسالت کے بعد رجوع الی قرآن تیسرا اہم ستون ہے۔ آپ کے نزدیک رجوع الی القرآن کے درج ذیل پانچ تقاضے ہیں۔ ۱۔ قرآن سے تعلق حبی ۲۔ قرآن کی کثرت سے تلاوت ۳۔ قرآن مجید کو تدبر و تفکر کے ساتھ پڑھا جائے ۴۔ انسان قرآنی تعلیمات و احکام پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو عمل کی تلقین کرے۔ ۵۔ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دے۔

زیر نظر کتاب "سورہ فاتحہ اور تعمیر شخصیت" اس حقیقت کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ درج بالا پانچوں تقاضوں کو اگر من میں اتار کر قرآن حکیم سے اکتساب فیض کیا جائے تو سورہ فاتحہ ہی ہمیں زندگی کے تمام شعبوں کے لئے مستقل رہنما اصول فراہم کرتی ہے بشرطیکہ غور و فکر کرنے والا بھی بزم عشق مصطفوی ﷺ کا پروردہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری جیسا دانائے راز ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنی علوم و معارف کا کامل فہم عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

العارض

علی اکبر الازہری

باب-۱

سورہ فاتحہ کے اسماء
اور
ان کی معنوی خصوصیات

سورۃ الفاتحہ قرآن حکیم کی پہلی سورت ہے۔ اس کو سورت کے اعتبار سے تنزیل اور تدوین کی دونوں ترتیبوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے (موضوع اولیت کی تفصیل آگے آئے گی) یہ کل سات آیتوں پر مشتمل ہے۔ امام خازنؒ کے قول کے مطابق اس میں ستائیس (۲۷) کلمات اور ایک سو چالیس (۱۴۰) حروف ہیں؛ اس کے بارے میں کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے کا کوئی قول نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں سے سورہ فاتحہ تعدّد اسماء کی بناء پر منفرد ہے۔ کیونکہ احادیث میں اس کے بہت سے نام وارد ہوئے ہیں اور یہ بھی ایک طے شدہ امر ہے کہ اسماء کی کثرت مسمّیٰ کے شرف وکمال اور اوصاف وخصائص کی کثرت پر دلالت کرتی ہے۔ ذات باری تعالیٰ کی صفاتِ حسن، کمال بیشمار تھیں اس لئے اس کے اسماء بھی حیطۂ شمار سے ماوراء ہیں؛ نبی اکرم ﷺ کے اوصاف وکمالات حق تعالیٰ کی مظہریت تامہ کی وجہ سے لاتعداد تھے۔ اس لئے ان کے اسماء بھی احصاء وتعداد سے ماوراء ہیں۔ خود قرآن حکیم کے متعدد اسماء اس کی بے شمار برکتوں اور فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا جو شے جس قدر ہمہ پہلو جامع اور ہمہ گیر ہو گی اس کی مختلف حیثیتوں اور شانوں کو اجاگر کرنے کے لئے اسی قدر نام بھی معرض ظہور میں آئیں گے اور اس طرح ظاہر میں کسی کا متعدد الاسماء ہونا باطن میں اس کے متعدد الاوصاف ہونے کی دلیل قرار پا جائے گا۔ متذکرہ بالا اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو سورہ فاتحہ کا شرف وکمال اور قدر ومنزلت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی سورت ہے جس کے کئی نام خود آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے بیان فرمائے اور ان میں سے ہر نام اس کی مختلف حیثیات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اب اس سورت کے مختلف اسماء اور ان کے فلسفہ وحکمت کا جائزہ لیا جاتا ہے:-

۱- سورۃ الفاتحہ

اس سورت کا سب سے معروف نام یہی ہے۔ جس سے ہر خاص وعام اس کو

پکارتا ہے۔ اس نام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس سورت کے دیگر اسماء کا بھی جامع ہے اور کم و بیش اس کے تمام اوصاف و امتیازات کو محیط بھی ہے۔

○ فاتحہ ----- بمعنی ازالۂ اغلاق و اشکال (فتح مشکلات)

فاتحہ 'فَتْحٌ' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھولنے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:-

الفتح ازالۃ الاغلاق والاشکال کسی بندش اور مشکل کو دور کردینا فتح کہلاتا ہے۔ (المفردات: ۳۷)

اس لحاظ سے فاتحہ اس شئے کو کہا جائے گا جو بندشوں' رکاوٹوں اور مشکلوں کو دور کردے۔ کسی بندش اور رکاوٹ کا دور ہونا یہ ہے کہ راستہ کھل جائے' رابطہ بحال ہو اور سلسلہ قائم ہو جائے۔ اسی طرح مشکل کا دور ہونا یہ ہے کہ وہ چھٹ جائے اور سہولت و آسائش میسر آئے۔ گویا فتح کا اطلاق اس نئی حالت پر ہو گا جو بندشوں' رکاوٹوں اور مشکلوں کے دور ہو جانے کے بعد نصیب ہو گی۔ مشکلات کے مرتفع ہونے کا عمل خدا کی "نصرت" ہے اور اس کے ثمرہ و نتیجہ کے طور پر آسودگی کی نئی حالت کا نصیب ہونا فتح ہے۔ اس نکتے کو قرآن حکیم کی درج ذیل آیات کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا○

(سورۃ النصر' ۱۱۰: مکمل)

جب اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچے اور آپ لوگوں کو دیکھ لیں (کہ) وہ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں تو آپ (تشکراً) اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح فرمائیں اور (تواضعاً) اس سے استغفار کریں۔ بے شک وہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا (اور مزید رحمت کے ساتھ رجوع فرمانے والا) ہے۔

پہلی آیت میں دو لفظ بیان ہوئے ہیں' خدا کی نصرت اور فتح۔ مشکلات پر قابو پانے اور کامیابی و کامرانی کے راستوں میں حائل رکاوٹوں اور بندشوں کو دور کرنے کا عمل خدا کی مدد و نصرت سے تکمیل پذیر ہوا اور اس کے نتیجے میں اہل ایمان کو "حالت فتح" نصیب ہوئی' جس کی وضاحت قرآن نے یوں کی کہ اب لوگ جوق در جوق کثرت کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ یعنی جو امر پہلے بندشوں کی وجہ سے مشکل اور باعث اضطراب تھا اب حالت فتح میں آسان اور باعث سکون ہو گیا۔ لہٰذا فاتحہ سے مراد رب کائنات کا وہ انعام ہے جو تمام رکاوٹوں کے دور ہو جانے کے بعد لطف و سکون اور اطمینان و آسودگی کی صورت میں عطا ہوتا ہے۔ پس اس سورہ کو سورہ فاتحہ اس وجہ سے قرار دیا گیا کہ اس کی تاثیرات و کمالات میں یہ امر انتہائی اہم تھا کہ یہ مشکلوں کو آسانیوں اور بندشوں کو فراوانیوں میں بدل دیتی ہے۔ اسی لئے سرور دو عالم ﷺ نے فرمایا:-

کل امر ذی بال لم یبدا فیہ بالحمد فھو اقطع جو بامقصد کام حمد الٰہی سے شروع نہ کیا گیا ہو اس میں (حقیقی) کامیابی نہیں ہوتی۔ (ابن ماجہ: ۱۳۷)

کیونکہ راستے کی مشکلات کام کے اپنے صحیح انجام تک پہنچنے میں حائل ہوتی ہیں۔ اس سے قبل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر میں بھی ایسی روایت بسم اللہ کے سلسلے میں گزر چکی ہے۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ بسم اللہ دراصل حمد اور فاتحہ ہی کی حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے الفاتحہ کی یہ خصوصیت آشکار ہوئی کہ وہ انسانی زندگی میں ظاہری طور پر محسوس ہونے والی مشکلات اور رکاوٹوں کا ازالہ کرتی ہے اور اپنے فیضان تعلیم سے راہ حق کے متلاشیوں کو آسانی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔

۲- فاتحہ ---- بمعنی ازالۂ رنج والم (فتح برکات)

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں "فتح" کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔ فتح ظاہری اور فتح باطنی:-

احدهما يدرک بالبصر كفتح الباب ونحوه وكفتح القفل والغلق والمتاع --- والثاني يدرک بالبصيرة كفتح الهم وهو ازالة الغم

(المفردات: ۳۷۰)

ایک آنکھ سے معلوم ہوتی ہے جیسے دروازہ کھولنا' تالہ' گانٹھ اور سامان کھولنا وغیرہ۔ دوسری نور بصیرت سے معلوم ہوتی جیسے غم والم کو کھولنا یعنی ازالہ کرنا۔

جیسا کہ فتح ظاہری سے مراد کسی دروازے کا کھلنا' کسی بندش' مشکل یا رکاوٹ وغیرہ کا دور ہونا ہے' اسی طرح فتح باطنی سے مراد رنج والم اور غم واندوہ کا دور ہونا اور لوگوں کا احتیاج و مصیبت سے نجات پانا ہے۔ مثلاً کسی بے چین کو آرام مل جائے' پریشان حال کو خوشی نصیب ہو' تنگدست کو فراخیٔ رزق عطا ہو اور کسی محروم کو اس کی آرزو میسر آجائے تو یہ فتح باطنی ہوگی۔ فتح کا یہ معنی قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:-

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا ....

(الانعام' ۶: ۴۴)

تو ہم نے (انہیں اپنے انجام تک پہنچانے کے لئے) ان پر ہر چیز (کی فراوانی) کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں (کی لذتوں اور راحتوں) سے خوش ہو (کر مدہوش ہو) گئے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

(الاعراف' ۷: ۹۶)

اور اگر (ان) بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے۔

یعنی انسان پر برکات سماوی کے ان دروازوں کا کھل جانا جن کا سے ظاہر میں ادراک بھی نہ ہو فتح کہلاتا ہے۔ چنانچہ **الفاتحہ** سے مراد اس حقیقی برکت و سعادت کا راستہ کھولنا ہے جو

[illegible]
میں ہزاروں الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہے۔ اسے ہر وقت جس ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب کی تلاش رہتی ہے وہ اسے دنیا کی تمام آسائشیں اور سہولتیں مل کر بھی مہیا نہیں کر سکتیں۔ اس سورت کا نام **الفاتحہ** اس لئے رکھا گیا کہ یہ جن مقاصد و تعلیمات، مطالب و معارف اور اسرار و غوامض کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے تھی اور جو اس کی حقیقت اور الفاظ و تصورات کا ماحصل تھے صرف وہی اسرار و تعلیمات ہی غم واندوہ کے مہیب اندھیروں اور رنج والم کی محیط گھٹاؤں کو چھانٹ کر مضطرب دلوں کو سکون سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔

آئندہ صفحات میں آپ سورۃ الفاتحہ کے معانی و معارف کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ واقعی تمام الجھنوں اور پریشانیوں کا مداوا اسی سورت کی تعلیم میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی علمی تاثیرات اور روحانی برکات کے باعث اس کا نام **الفاتحہ** رکھا گیا کیونکہ اس سورت کی حقیقی روح کو دل میں اتار لینے سے سب غموں اور دکھوں کے دور ہو جانے کی ضمانت مل جاتی ہے۔

۳۔ فاتحہ ------- بمعنی فتحِ علوم وہدایات (فتحِ مغیبات)

فاتحہ اپنے تیسرے معنی کے اعتبار سے ایسے انشراحِ صدر کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ جس سے علوم و معارف اور **مغیبات** ربانی کے علم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسے **فتح المستغلق من العلوم** کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں عربی میں کہا جاتا ہے۔

فلان فتح من العلم بابا مغلقا — اس نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔

(المفردات: ۳۷۰)

اس معنی کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ
(البقرہ، ۲:۷۶)

کہتے ہیں کیا تم ان (مسلمانوں) سے (نبی آخر الزماں ﷺ کی رسالت اور شان کے بارے میں) وہ باتیں بیان کر دیتے ہو

جو اللہ کے حکم پر (تورات کے ذریعے)
ظاہر کی ہیں تاکہ اس سے وہ تمہارے
رب کے حضور تمہیں پر حجت قائم
کریں۔

علم کے کھلنے سے مراد وہ علم نہیں جو صحیفوں سے میسر آتا ہے بلکہ یہ وہ علم ہے جس کا سوتا انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے اور وہ سینوں سے سینوں تک منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی **فتح** سے **مفتاح** **مشتق** ہوا ہے جس کا معنی کنجی ہے۔ اس کی جمع **مفاتح** اور **مفاتیح** آتی ہے۔ کنجی وہ آلہ ہوتا ہے جس کے ذریعے بند چیز کو کھولا جائے یعنی جس کی وساطت سے بند اور مخفی چیز تک رسائی حاصل ہو سکے۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ
(الانعام ۶:۵۹)

اور غیب کی کنجیاں (یعنی وہ راستے جن سے غیب کسی پر آشکار کیا جاتا ہے) اسی کے پاس (اس کی قدرت و ملکیت میں) ہیں انہیں اس کے سوا (از خود) کوئی نہیں جانتا۔

اس آیت میں اور اس کے بعد جن کائناتی حقائق اور علوم و ہدایات کو غیب قرار دیا گیا ہے ان پر **مفاتح** یعنی کنجیوں کی اضافت نے اس امر کو اظہر من الشمس کر دیا کہ غیب قطعاً کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی پر کھل نہ سکے۔ اگر اسے ہمیشہ ہر ایک پر مخفی اور مستور ہی رہنا ہوتا تو اس کے ساتھ کنجیوں کا ذکر کبھی نہ ہوتا۔ **مفاتح** جو **مفتاح** کی جمع ہے اس کا تو مقصد ہی کھولنا اور منکشف کرنا ہے۔ گویا کنجیوں کا موجود ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ مشیت ایزدی غیب کو بند نہیں رکھنا چاہتی اسے کھولنا چاہتی ہے۔

لیکن بات صرف اتنی ہے کہ جس ذریعے اور آلے کی وساطت سے غیبی علوم وہدایات کا سینہ چاک ہوتا ہے، ان کے ادراک کا راستہ کھلتا ہے، ان تک رسائی اور ان کے علم و معرفت کی رکاوٹیں دور ہوتی ہیں وہ کنجیاں رب ذوالجلال کے پاس ہیں۔ ان

کا کوئی مالک نہیں۔ وہ ذات جس کے لئے چاہے غیب کو فتح فرما دے اور علوم وہدایات کے مخفی خزانوں کا دروازہ کھول دے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا کیونکہ وہی تمام غیب اور اس کی کنجیوں کا مالک ہے۔ اس لئے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:۔

عالم الغيب فلا يظهر على غيبه احدا ○ الا من ارتضى من رسول فانه يسلك من بين يديه ومن خلفه رصدا ○ (الجن ۲۷:۲۶۔۲۷)

وہ غیب کا جاننے والا ہے پس اپنے غیب پر کسی کو غالب اور مسلّط نہیں کرتا۔ سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے پس ان کے آگے پیچھے پہرہ مقرر کر دیتا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ غیب کے ساتھ مفتاح (یعنی **فتح و افتاح**) کا تصور ہی اس لئے دیا گیا تھا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ذات حق نہ صرف عالم الغیب ہے بلکہ **فاتح الغیب** بھی ہے جس کے لئے چاہے غیبی علوم وہدایات کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اس پر مغیبات عالم منکشف کر دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم نے ایک اور مقام پر اعلان فرمایا:۔

وما كان الله ليطلعكم على الغيب ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء فامنوا بالله ورسله (آل عمران ۳:۱۷۹)

اور اللہ کی شان یہ نہیں کہ (اے عامۃ الناس) تمہیں غیب پر مطلع کر دے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے سو تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

چنانچہ پورا قرآن اس امر پر شاہد ہے کہ جہاں کہیں بھی مغیبات کا ذکر آئے گا' قرآن یہ تو کہے گا کہ انہیں کوئی نہیں جانتا لیکن یہ اعلان کہیں نہیں کیا گیا کہ ان پر کسی کو مطلع اور آگاہ بھی نہیں کیا جاتا کیونکہ قرآن اس امر کی صراحت کر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ رسولوں پر غیب کو **فتح** فرما دیتا ہے یعنی کھول دیتا ہے۔ اس لئے اس مقدس سورت کا نام الفاتحہ (کھول دینے والی) رکھا گیا کہ یہ باری تعالیٰ کے خصوصی اور مخفی علوم وہدایات کے خزانوں کا دروازہ کھولنے والی تھی۔ گویا یہ سورت معارف ومغیبات

کے فتح و انشراح کے لئے اللہ تعالیٰ کی کنجیوں میں سے ایک کنجی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اس کا مقام سب سے اول رکھا گیا تاکہ لوگ جان لیں کہ قرآنی علوم وہدایات کا دروازہ اسی سورت سے کھلتا ہے۔ جسے سورۃ الفاتحہ کی حقیقت نصیب ہو گئی وہ یہ سمجھے کہ اس پر خزانہ علم وہدایات کھول دیا گیا۔

۴۔ فاتحہ ---------- بمعنیٰ غلبہ و تسلّط (فتح مہمات)

فاتحہ کا مادہ "فَتَحَ" عام طور پر غلبہ و تسلط اور کامیابی و کامرانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا — بے شک ہم نے آپ کے لئے روشن فتح فرما دی۔ (الفتح، ۴۸:۱)

یہاں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ خوشخبری سنائی گئی جو فتح خیبر اور فتح مکہ سے متعلق تھی اور بعد ازاں دیگر فتوحات اسلام کا دروازہ بھی اسی سے کھلتا تھا۔ اس امر کا مزید تذکرہ یوں کیا گیا:۔

فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا — چنانچہ اس نے ان پر اطمینان اتارا اور انہیں جلد آنے والی فتح کا انعام بخشا۔ (الفتح، ۴۸:۱۸)

اسی مادے کے باب استفعال سے "استفتاح" ہے جس کا معنی غلبہ و فتح اور کامیابی و کامرانی طلب کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے:۔

وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ (البقرہ، ۲:۸۹) — حالانکہ اس سے پہلے وہ خود (نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ اور ان پر اترنے والی کتاب قرآن کے وسیلے سے) کافروں پر فتح یابی (کی دعا) مانگتے تھے۔ سو جب ان کے پاس وہی نبی (حضرت محمد ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب قرآن کے ساتھ) تشریف لے آئے جسے

وہ (پہلے ہی سے) پہچانے ھٹے تو اسی کے

منکر ہو گئے۔

ان آیات سے یہ امر طے پاگیا کہ فتح واستفتاح کے الفاظ غلبے اور کامیابی وکامرانی کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ غلبہ وفتح عطا کرنے والی' کامیابی وکامرانی کی راہیں کھولنے والی اور منزل مقصود تک پہنچانے والی' اس سورت کو **الفاتحہ** اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی تاثیر وبرکات کے باعث اور اس کی تعلیمات کی صحیح پیروی کے نتیجے میں انسان کو اپنی مہمات اور جہد حیات میں فتح یاب ہونے اور کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہونے کی ضمانت میسر آتی ہے۔ یہ سورت جس مضمون اور بنیادی فلسفہ زندگی پر مشتمل ہے' یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان اسے ظاہر وباطن میں اپنائے اور پھر بھی کشمکش حیات میں کامیاب نہ ہو۔ اسلام کی اساسی اور انقلابی تعلیمات کا یہ خلاصہ جسے "**فاتحہ**" کے نام سے تعبیر کیا گیا اپنے اندر ہر مرحلہ عمل پر کامیابیوں کی مکمل ضمانت رکھتا ہے۔ آپ کو تعلیمات فاتحہ کے اس انقلابی پہلو کا اندازہ اس کے مطالب ومعارف کے تفصیلی جائزے سے ہو گا۔ جس کا بیان انشاء اللہ آگے آئے گا۔ گویا یہ سورت انسان کو دعوت دیتی ہے کہ اگر میری حقیقی تعلیمات کو اپنالو تو زندگی کے کسی مرحلے پر ناکام نہ ہو سکو گے۔

۵) فاتحہ---------- بمعنیٰ انکشاف حق وازالۂ شبہات (فیصلہ قطعیہ)

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے فاتحہ میں ازالہ اور انکشاف کا معنی موجود ہے۔ چنانچہ اس سے مراد وہ قول فیصل ہوا جو حق وباطل کے درمیان واضح امتیاز کے ساتھ تمام شکوک وشبہات کا خاتمہ کر دے تاکہ اس کے بعد نہ کسی کا کوئی عذر باقی رہے اور نہ کوئی مغالطہ والتباس۔ اس لئے قیامت کے دن کو "**یوم الفتح**" قرار دیا گیا ہے کہ اس دن خیر وشر' نیک وبد اور حق وباطل ہر ہر چیز خوب مفصل ہو جائے گی۔ حق کا ہر ایک پر کھلا انکشاف ہو جائے گا اور کسی کا کوئی شبہ یا عذر باقی نہ رہے گا اور وہ آخری فیصلے کا دن ہو گا۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ کفار ومشرکین آنحضرت ﷺ سے سوال کرتے تھے:۔

وَيَقُولُونَ مَتىٰ هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ○ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَايَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِيْمَانُهُمْ وَلَاهُمْ يُنْظَرُوْنَ○

(السجدہ ۳۲:۲۸، ۲۹)

اور وہ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہو گا اگر تم سچے ہو۔ فرما دیجئے فیصلے کے دن کافروں کو (اگر وہ ایمان لے بھی آئے تو) ان کا ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں (پھر) مہلت ملے گی۔

اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن حکیم میں یہ دعا مذکور ہے:۔

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ

(الاعراف ۷:۸۹)

اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری (مخالف) قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوا کہ فتح سے مراد ایسا فیصلہ ہے جو حق و باطل میں کھلا امتیاز پیدا کر دے یعنی احقاق حق اور ابطال باطل کا باعث ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِيْنَ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ○

(الانفال ۸:۷، ۸)

اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلام سے حق کو حق ثابت فرما دے اور (دشمنوں کے بڑے مسلح لشکر پر مسلمانوں کی فتح یابی کی صورت میں) کافروں کی (قوت اور شان و شوکت کی) جڑ کاٹ دے تاکہ (معرکہ بدر اس عظیم کامیابی کے ذریعے) حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل کر دے اگرچہ مجرم لوگ (معرکۂ حق و باطل کی اس نتیجہ خیزی کو) ناپسند ہی کرتے رہیں۔

[illegible]
فلسفہ و حقیقت حق و باطل کے درمیان واضح فیصلہ اور قطعی فرق و امتیاز کو متحقق کرنا تھا۔ اس لئے قرآن وسنت اور دین حق کی تمام اصولی تعلیمات کی حقیقی روح یہی سورت ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ہے باطل اور مکرو فریب ہے۔ سورت ہذا نے "صراط مستقیم" کا جو جامع و مانع تصور پیش کیا ہے اس میں راہ حق کی نشاندہی بھی ہے اور راہ باطل کی بھی۔ مزید برآں دونوں راستوں کو افراد کے حوالے سے اس طرح معین و مشخص کر دیا گیا کہ کسی شبے اور مغالطے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ سورہ فاتحہ کی شان فاتحیت کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ اس نے سیدھے راستے (یعنی راہ ہدایت) کے تعین کو لوگوں کی اپنی طبائع اور ان کے ذاتی فیصلوں پر منحصر نہیں چھوڑا کہ وہ قرآن وسنت کی من مانی تعبیرات و تاویلات کر کے اپنے اپنے راستوں کو صراط مستقیم کہتے پھریں بلکہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ان لوگوں کا راستہ سیدھا ہے جن پر تو نے انعام فرمایا نہ کہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔

کے الفاظ میں وضاحت کر کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین جو قرآنی اصطلاح کے مطابق خدا کے انعام یافتہ بندے ہیں، کے راستوں کو متعین کر دیا تاکہ نوع انسانی کو یہ علم ہو جائے کہ ان صلحاء اور مقبولین الٰہی کی پیروی ہی درحقیقت قرآن وسنت کے راستے کی پیروی ہے اور جو کوئی ان کی پیروی سے گریزاں ہو گا وہ یقیناً باطل ہو گا۔ اس لحاظ سے سورہ فاتحہ قرآن حکیم کی شان فرقانیت کی مظہر قرار پاتی ہے کہ اس نے راہ حق کو راہ باطل سے جدا کر دیا۔

۶- فاتحہ -------- بمعنیٰ اول و آخر

جیساکہ پہلے واضح ۔ ہے کہ فاتحہ میں کسی شے کو کھولنے اور اس کے افتتاح کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں سے کسی چیز کا افتتاح ہو وہی اس کا نقطہ آغاز اور مقام اولین ہوتا ہے۔ کیونکہ مابعد کی ابتداء اسی نقطے سے

ہوتی ہے۔ اس لئے فاتحہ کی تعریف میں ائمہ محققین لکھتے ہیں۔

فاتحة كل شی مبدؤه الذی یفتح به مابعده (المفردات: ۳۷۰)

ہر شے کا فاتحہ اس کا مبداء ہوتا ہے یعنی وہ نقطہ جس سے وہ شروع ہوتی ہے اور اس شے کا مابعد اسی مبداء سے کھلتا ہے۔

اس سورت کا نام فاتحہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کی حقیقت جو بیان ربوبیت پر مبنی ہے اس کائنات میں انسانی حقیقت کا نقطہ آغاز اور کلمہ اولین ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ جب حقیقت انسانی کو معرض وجود میں لایا گیا تو تمام انسانوں کو عالم ارواح میں اکٹھا کر کے رب کائنات نے فرمایا۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ (الاعراف، ۷: ۱۷۲)

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ (سب) بول اٹھے کیوں نہیں؟ (تو ہی ہمارا رب ہے) ہم گواہی دیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن یہ (نہ) کہو کہ ہم اس عہد سے بے خبر تھے۔

لہذا حقیقت انسانی کا آغاز جس کلمے سے ہوا وہ اقرار ربوبیت تھا اور یہی کلمہ سورہ فاتحہ کا عنوان اور مضمون قرار دے دیا گیا۔ گویا وہ وعدہ جو انسان نے اپنے سفر حیات کے آغاز کے وقت اللہ تعالیٰ سے عالم ارواح میں کیا تھا جسے قیامت تک یاد رکھنے کی تلقین بھی کی گئی تھی اور اسی پر ذات حق نے خود کو گواہ بنایا تھا اس کو الفاظ و حروف کی صورت میں قرآن کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس سورت کے افتتاحی کلمات **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ** پکار پکار کر انسان کو روز اول کے وعدے کی یاد دلا رہے ہیں تاکہ خدا کی گواہی اس کے کلام کی صورت میں قیامت تک موجود رہے۔ اس سورت کا نام بھی فاتحہ اس لئے رکھا گیا کہ انسان کے ذہن میں یہ شعور بیدار رہے کہ یہی وہ سبق ہے جہاں سے میری کتاب زندگی کا افتتاح ہوا تھا اور اس سبق کو تاقیامت یاد رکھنے کے حکم کا معنی ہے کہ انسان سمجھتا رہے کہ اسی سبق پر میری کتاب زندگی کا اختتام بھی ہو گا۔ گویا فاتحہ کی

تعلیم اور اس کی حقیقت انسان کی کتاب حیات کا پہلا سبق بھی یہی تھا اور آخری سبق بھی یہی ہو گا۔ اس لئے فاتحہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اول بھی ہے اور آخر بھی۔ جو چیز حقیقت میں اول ہوتی ہے وہی آخر ہوتی ہے۔ دائرہ جس نقطے سے شروع ہوتا ہے اسی پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر نقطہ اولیں اور نقطہ آخریں الگ الگ ہو جائیں تو دائرے کی حیات میں تسلسل باقی نہ رہے گا' اس لئے اس کا اول ہی آخر قرار پاتا ہے۔ آپ ایک درخت کا آغاز بیج بو کر کرتے ہیں۔ اسے پانی ملتا ہے تو زمین سے نازک کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے' اس کی شاخیں بنتی ہیں' اس پر پھول لگتے ہیں' آخر میں پھل نمودار ہوتا ہے' پھر پھل پکتا ہے اور کھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقصد اور منزل تھی جس کے لئے آپ نے اس درخت کو بویا تھا لیکن جب آپ پھل اتار کر کھاتے ہیں تو آخر میں پھر وہی بیج رہ جاتا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ یہی بیج اول بھی تھا اور آخر بھی ہو گیا۔ اسی طرح حیات انسانی کا سفر جس نقطے سے شروع ہوا تھا۔ اسی پر پہنچ کر اختتام پذیر بھی ہو گا۔ اس لئے فاتحہ کا جو سبق اول تھا وہی آخر بھی ہو گا۔ جو ابتدا تھی وہی انتہا بھی ہو گی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو چیز اول بھی ہو اور آخر بھی۔ ابتدا بھی ہو اور انتہا بھی تو درمیان کے سب مدارج اور کمالات اس کے دامن میں ہوتے ہیں' اس سے خارج کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے حقیقت فاتحہ جو اول بھی ہے اور آخر بھی' حیات انسانی کے تمام کمالات و فضائل اسی کے اندر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے اس کا نام **"ام الکتاب"** تجویز فرمایا۔

چنانچہ حیات انسانی کی کائنات میں جو کچھ بھی ہے سورہ فاتحہ کی تعلیم اس کی پہلی حقیقت ہے۔ اگر حیات انسانی ایک سفر ہے تو یہ اس کا مقام آغاز ہے۔ اگر وہ ایک جمال ہے تو یہ اس کا پہلا نظارہ ہے۔ اگر وہ ایک نغمہ ہے تو یہ اس کی پہلی صدا ہے۔ اگر وہ ایک وقت ہے تو یہ اس کا پہلا لمحہ ہے۔ اگر وہ ایک درخت ہے تو یہ اس کا تخم اولیں ہے۔ اگر وہ ایک دائرہ ہے تو یہ اس کا نقطہ ابتدا ہے۔ غرض کہ حیات انسانی کی حقیقتوں اور سعادتوں میں جو کچھ بھی ہے اسی سے نمود پاتا ہے اور اسی پر کمال کو پہنچے گا۔ یہی وجہ

ہے کہ یہ سورت قرآن کے تئیس سالہ دور نزول میں سب سے پہلے نازل ہوئی اور باوجود "ترتیب نزولی" اور "ترتیب تدوینی" کے فرق کے اسے کتابی مجموعے میں بھی سب سے پہلی جگہ عطا کی گئی۔ اس کے سوا یہ شرف نہ کسی اور سورت کو مل سکا نہ کسی آیت کو۔

۲- فاتحۃ الکتاب ۳- فاتحۃ القرآن

ان ناموں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سورت کتاب مجید کی افتتاحی سورت ہے اور اسی سے قرآن حکیم کا آغاز ہوا ہے۔ یہ نام خود آنحضرت ﷺ کے بیان کردہ ہیں۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:-

لا صلوٰۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب اس شخص کی نماز نہ ہوئی جس نے فاتحۃ الکتاب (یعنی سورہ فاتحہ) نہ پڑھی۔

(مسند احمد ۵: ۳۲۲) (ابن کثیر ۱: ۱۲)

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سورت کا نام **فاتحۃ القرآن** یعنی قرآن کا افتتاح کرنے والی سورت اس لیے رکھا گیا کہ یہ ترتیب نزولی اور ترتیب تدوینی دونوں میں سب سے پہلی تھی۔ گویا سب سے پہلے اسی سورت کو نازل کیا گیا اور مصحف میں بھی سب سے پہلے اسی کو رکھا گیا۔ حالانکہ قرآن مجید کی کتابی ترتیب، نزولی ترتیب سے بالکل مختلف تھی۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو سورت یا آیت پہلے نازل ہوئی ہو اس کو کتابی ترتیب میں بھی اسی طرح اولیت دی جائے اور جو آیت یا سورت آخر میں نازل ہوئی ہو اسے سب سے آخر میں رکھا جائے۔ نزول قرآن کی ترتیب وقتی اور ہنگامی تھی۔ جس جس طرح حالات و واقعات تقاضا کرتے ان کے مطابق آیات اور سورتیں نازل کی جاتیں تھیں۔ لیکن حفظ اور تلاوت کی ترتیب آنحضرت ﷺ صحابہ کرامؓ کو الگ طور پر بیان فرماتے۔ یہ ترتیب محض اجتہادی نہ تھی بلکہ توقیفی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید کی ترتیب تنزیل اور ترتیب تدوین دونوں اذن الٰہی سے طے پائی تھیں اور یہ شرف صرف سورہ فاتحہ کو حاصل ہوا کہ نازل ہونے کے اعتبار سے بھی سب سے پہلے تھی اور کتابی

[illegible] پہلا مقام پایا۔ یہ اس سورت کی شانِ اولیت کی
کے باعث اس کا نام فاتحۃ الکتاب رکھا گیا۔

۴۔ ام الکتاب ۵۔ ام القرآن

یہ دو نام بھی احادیث نبویہ سے ثابت ہیں۔ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القران (مسند احمد، ۵: ۳۲۲) (ابن کثیر، ۱: ۱۲)

جس شخص نے اپنی نماز میں ام القرآن نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔

" ام "عربی زبان میں اصل یعنی جڑ کو کہتے ہیں۔ کسی بھی درخت کی جڑ اس کی تمام تاثیرات اور خصائص و ثمرات کا منبع ہوتی ہے۔ اس درخت کے جملہ فوائد اصلاً اس کی جڑ میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا ظہور درخت کے تنے، شاخوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ گویا درخت کی تمام خصوصیات کا اجمال اس کی جڑ میں ہوتا ہے اور درخت کے باقی تمام حصے اس اجمال کی تفصیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح سورہ الفاتحہ کو خود صاحب قرآن ﷺ نے قرآن کی اصل قرار دیا۔ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سورت شجر قرآن کی جڑ ہے، علوم قرآن کی تفصیلات کا اجمال ہے، کتاب الٰہی کے جملہ معارف و مقاصد کا خلاصہ ہے اور تمام قرآنی تعلیمات کا منبع و سرچشمہ ہے۔ اسی لیے سورہ الفاتحہ کی جامعیت کے ضمن میں یہ فرمایا گیا ہے:-

کل العلوم مندرج فی الکتب الاربعۃ و علومها فی القران و علوم القران فی الفاتحۃ (تفسیر کبیر، ۱: ۹۹)

تمام علوم و معارفِ کائنات چار الہامی کتابوں میں درج کیے گئے اور ان کے تمام علوم قرآن میں جمع کر دیے گئے اور تمام علوم قرآن سورہ فاتحہ میں مجتمع کر دیئے گئے ہیں۔

اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ ہر جامع کام کو یا کسی کام کی جڑ کو جس کی شاخیں اور اجزاء اسی کے تابع ہوں "ام" کہتے ہیں۔ ام الرأس اس جلد کو کہا جاتا ہے جو

پورے دماغ کی جامع ہوتی ہے۔ اہل عرب اپنے جھنڈے یا ایسے نشان کو جس کے نیچے سب کے سب جمع ہوتے ہیں "ام" کہتے ہیں۔ مکہ کو بھی **ام القری** اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ سب سے پہلا شہر ہے اور سب کا جامع بھی ہے۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لئے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔
(آل عمران '۳:۹۶)

احادیث سے ثابت ہے کہ زمین بھی وہیں سے پھیلائی گئی۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ اللہ نے عزت (وادب) والے گھر کعبہ کو لوگوں کے (دینی و دنیوی امور میں) قیام (امن) کا باعث بنا دیا ہے۔
(المائدہ '۵:۹۷)

لہذا شہر مکہ کی اصلیت و اولیت اور جامعیت و مرکزیت کی وجہ سے اسے **ام القری** کا لقب دیدیا گیا۔ عربی شعراء کے کلام میں بھی اسی مفہوم کی جابجا تائید ملتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الفاتحہ کو **ام الکتاب یا ام القران** کے نام سے تعبیر کیا جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ سورت قرآن کی سب سے پہلی سورت بھی ہے، تعلیمات و مطالب قرآنی کے اعتبار سے مرکزی سورت بھی ہے اور علوم و معارف ربانی کے لحاظ سے جامع بھی۔

اگر سورہ فاتحہ کی آیات اور ان کے معانی و مطالب پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ واقعی یہ سورت تمام قرآنی تعلیمات کا اجمال ہے۔ قرآن حکیم کی جملہ تعلیمات تین اقسام پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ علوم العقائد ۲۔ علوم الاحکام ۳۔ علوم التذکیر

پہلی قسم انسانوں کے معتقدات اور خیالات و نظریات کی اصلاح کے لئے ہے، دوسری قسم انسانی اعمال اور احوال و اطوار کو سنوارنے کے لئے ہے اور تیسری قسم باری تعالٰی کے انعام و اکرام اور عذاب و عقاب کے تذکروں سے قلب و باطن میں

[illegible] کہ انہیں جلاء و تطہیر بخشنے کے لئے [illegible] الغرض [illegible]
والناس تک پورے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ یہی تین قسم کی بنیادی تعلیمات منصہ شہود پر آتی ہیں۔ سورہ فاتحہ کے جملہ مطالب بھی انہی تین انواع پر منقسم ہیں۔

پہلی تین آیات باری تعالیٰ کی "الوہیت" "ربوبیت" "استحقاق حمد" "رحمانیت" "رحیمیت" "مالکیت" "ثبوت آخرت" اور "جزاوسزا" کے مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس لئے یہ علوم العقائد کی اصل قرار پائیں۔ چوتھی اور پانچویں آیت "عبادت" "استعانت" اور "طلب ہدایت" کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس لیے اصلاح عقائد کے ساتھ ساتھ یہ علوم الاحکام کی اصل قرار پائیں اور بقیہ دو آیتیں باری تعالیٰ کے "انعام یافتہ بندوں" اور "غضب یافتہ بندوں" کے تذکرے پر مشتمل ہیں۔ اس لئے یہ رب ذوالجلال کے لطف و کرم اور عذاب و عقاب کے حوالے سے علوم التذکیر کی اصل قرار پائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت کی معنوی وسعت و جامعیت کی بناء پر اسے **ام الکتاب** اور **ام القران** کے القابات سے نوازا گیا۔

٦- سورۃ الکنز

سورہ فاتحہ کے اسماء مبارکہ میں سے ایک نام **سورۃ الکنز** بھی ہے۔ کنز، خزانے کو کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ بھی متذکرہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ سورت جملہ علوم و ہدایات، معانی و معارف اور اسرار و رموز کا خزانہ ہے۔ قرآن حکیم کے خصوصی روحانی ثمرات و فضائل اور برکات و خصائص کا خزانہ بھی یہی سورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گروہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام پر وحی والہام کی صورت میں بے پایاں انعام کیے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو جن امتیازی نوازشات سے بہرہ اندوز کیا گیا ان میں سے ایک یہ سورت بھی ہے۔ یہ ایک ایسا خزانہ ہے جس سے سوائے خاتم الانبیاء ﷺ کے کسی اور کو نہ نوازا گیا۔ امام احمد بن حنبل"، امام

بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام مالک، امام واقدیؒ اور دیگر آئمہ نے متعدد طرق سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث صحیح روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ دریں اثناء رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے پھر پکارا تو میں نے نماز ہلکی کر دی اور جلدی سے فارغ ہو کر آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تک کس کام میں مصروف تھے، تم نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے عرض کیا کہ:۔ حضور میں نماز میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تم نے نہیں سنا:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال، ۸: ۲۴)

اے ایمان والو! جب (بھی) رسول تمہیں کسی کام کے لئے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے فوراً حاضر ہو جایا کرو۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ خطا ہوئی ہے۔ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ اچھا سنو! میں تمہیں ایک ایسی سورت بتاتا ہوں۔ جس کی مثل تورات، زبور، انجیل اور قرآن میں بھی نہیں ہے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

والذی نفسی بیدہ ما انزلت فی التوراۃ و لا فی الانجیل و لا فی الزبور و لا فی الفرقان مثلھا۔ (جامع الترمذی باب ما جآء فی فضل الفاتحہ، ۲: ۱۱۵)

خدا کی قسم جسکے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی مثل توراۃ، انجیل، زبور اور خود قرآن میں بھی نازل نہیں فرمائی

اس کے بعد فرمایا اور وہ قرآن میں بھی سب سے بڑی ہے۔ پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے جب آپ ﷺ نے مسجد سے باہر جانے کا ارادہ کیا تو میں نے آپ ﷺ کو وعدہ یاد دلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا نماز میں کیا پڑھتے ہو؟ میں نے **الحمد للہ رب العلمین** آخر تک پڑھ کر سنائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔ "یہی سورت ہے جو سبع مثانی ہے اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا"۔ اس طرح اس سورت کا باری تعالیٰ کے

خصوصی خزانوں میں سے عظیم خزانہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۷۔ سورۃ النور

یہ نام بھی احادیث نبوی سے ثابت ہے۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے اوپر دیکھ کر فرمایا۔ آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے جو پہلے کبھی نہیں کھلا تھا۔ پھر وہاں سے ایک فرشتہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا۔ یا رسول اللہ ﷺ خوش ہو جایئے:۔

ابشر بنورین قد اوتیتھما لم یوتھما نبی قبلک فاتحۃ الکتاب و خواتیم سورۃ بقرۃ لم تقراء حرفا منھا الا اوتیتہ

(صحیح مسلم، ۱: ۲۷۱)

آپ کو دو نور ایسے عطا کیے گئے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے تھے۔ ایک سورہ فاتحہ اور دوسرا سورہ بقرہ کی آخری دس آیات۔ ان میں سے جو جو حرف آپ پڑھیں گے آپ کو نور میسر آئے گا۔

ویسے تو اس ارشاد ایزدی کے مطابق سارا قرآن ہی نور ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا

(النساء، ۴: ۱۷۴)

اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (ذات محمدی ﷺ کی صورت میں ذات حق جل مجدہ کی سب سے زیادہ مضبوط، کامل اور واضح) دلیل قاطع آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف (اسی کے ساتھ قرآن کی صورت میں) واضح اور روشن نور (بھی) اتار دیا ہے۔

لیکن سورہ فاتحہ کو مجموعی طور پر اور پھر اس کے ایک ایک حرف کو انفرادی

نور پر نور سے تعبیر کرنا اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ سورت اس قرآن کے انوار و تجلیات کا **منتہائے** کمال ہے۔ اگر قرآنی نور کی آب و تاب اور چمک دمک کو نقطۂ عروج پر دیکھنا مطلوب ہو تو یہ ایک ہی سورت کافی ہے۔ اسی نور اتم کے رنگا رنگ جلوے پورے قرآن میں مختلف مقامات پر دکھائی دے رہے ہیں۔ یوں تو سارا قرآن نور ہے لیکن اس نور کا پیکر کمال سورہ فاتحہ ہے۔

۸- السبع المثانی

اس کا معنی ہے۔ "دہرائی جانے والی یا بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں"۔ سورۃ الفاتحہ کا یہ نام خود قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ ارشاد ایزدی ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (الحجر ۱۵: ۸۷)

اور بے شک ہم نے آپ کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں (یعنی سورہ فاتحہ) اور بڑی عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے۔

اس آیت میں "**سبعا من المثانی**" سے مراد بالاتفاق سورہ فاتحہ ہے۔ کیونکہ یہی وہ سورت ہے جو سات آیتوں پر مشتمل ہے اور نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں **سبعا من المثانی** کے بعد **و القران العظیم** کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں سے دو مفہوم مستنبط ہو سکتے ہیں:۔

ایک یہ کہ اگر یہاں واؤ جو **المثانی** اور **القران** کے درمیان آئی ہے سے مراد واؤ عاطفہ ہو تو اس کا معنی "اور" ہو گا۔ پھر مفہوم یہ ہو گا کہ اے رسول ﷺ ہم نے آپ کو دو گرانقدر چیزیں عطا کی ہیں۔ ایک "سورہ فاتحہ یعنی سات آیتیں جو ہر نماز میں دہرائی جاتی ہیں اور دوسری "قرآن عظیم"۔ ان دونوں کا آپس میں ربط یہ ہو گا کہ سورہ فاتحہ تمام علوم الٰہیہ کا اجمال ہے جو آپ کو عطا کیا گیا اور قرآن عظیم اس اجمال کی تفصیل۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:۔

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ

اور ہم نے آپ پر وہ عظیم کتاب نازل

فرمائی ہے جو ہر چیز کا بڑا واضح بیان ہے۔ (النحل ۱۶:۸۹)

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:۔

وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (الانعام ۶:۵۹)

اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے۔)

مزید برآں قرآن مجید کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ (یوسف ۱۲:۱۱۱)

یہ قرآن ازل سے ابد تک کائنات کی ہر شے کی تفصیل ہے۔

اس موضوع پر مقدمہ تفسیر منہاج القرآن "**مناہج العرفان فی لفظ القران**" میں لفظ قرآن کے پہلے مادہ **اشتقاق** کے ضمن میں جامعیت قرآن کے عنوان سے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مزید معلومات کے لیے وہ باب ملاحظہ فرمائیں۔

مختصر یہ کہ وہ قرآن جو جملہ معارف و حقائق کائنات کی تفصیل تھا، سورہ فاتحہ اس کا اجمال قرار پائی اور باری تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر اپنی نعمتوں اور رحمتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے حبیب ﷺ! ہم نے آپ کو تمام علوم و معارف کائنات کا اجمال بھی عطا کر دیا اور اس کی تفصیل بھی۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا:۔

اوتیت بجوامع الکلم (صحیح البخاری ۲:۱۰۸)

مجھے تمام کلاموں کا مجموعہ اور ماحصل عطا کر دیا گیا۔

اسی خزانہ علم کا تذکرہ امام شرف الدین بوصیری ؒ نے یوں کیا ہے:۔

فان من جودک الدنیا و ضرتها
و من علومک علم اللوح والقلم
و کلهم من رسول الله ملتمس
غرفا من البحر او رشفا من الدیم

(قصیدہ بردہ)

یا رسول اللہ ﷺ بیشک آپ کے خرمن جود و سخا میں دنیا بھی ہے اور آخرت بھی اور لوح و قلم کے سارے علوم آپ کے علوم کا حصہ ہیں اور تمام انبیاءؑ و مرسلین علیہم السلام آپ ہی کے در دولت پر دست سوال دراز کیے ہوئے ہیں۔ خواہ وہ آپ کے بحرِ عطا سے چلو کی خیرات مانگ رہے ہوں یا فیضان عطا سے نمی کی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر واوٴ متذکرہ تفسیری ہو تو معنی یوں ہو گا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم نے آپ کو یہ سات آیتیں (یعنی سورہ فاتحہ) ایسی عطا کی ہیں کہ یہی قرآن عظیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں۔ چونکہ قرآن عظیم اپنی جملہ تعلیمات اور علوم و معارف کے لحاظ سے اسی ایک ہی سورت میں سمو دیا گیا تھا اس لئے اسے ہی تشریفاً "القرآن العظیم" کا نام دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسند احمد، دار قطنی اور بیہقی میں حضرت ابوھریرہ، حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنھم اجمعین سے ثقہ روایات کے ساتھ یہ الفاظ منقول ہیں آنحضرت ﷺ نے کئی مقامات پر فرمایا:۔

وھی ام القران وھی ام الکتاب وھی فاتحۃ الکتاب وھی السبع المثانی و القران العظیم الذی اعطیت	یہی ام القرآن ہے، یہی ام الکتاب ہے، یہی فاتحہ الکتاب ہے، یہی سبع مثانی ہے اور یہ وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا

(ابن کثیر، ۱:۱۰)

۹۔ اساس القرآن

سورہ فاتحہ کا ایک نام "اساس القرآن" بھی ہے۔ اس نام کا مفہوم بھی پہلے ناموں کی توضیح سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ اساس بنیاد کو کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں مذکورہ ہے:۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى	البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔

(التوبہ، ۹:۱۰۸)

بنیاد ہمیشہ ان اینٹوں پتھروں کو کہا جاتا ہے جو تعمیر میں سب سے پہلی ہوں اور

اسی پر باقی تمام الحمد کا انحصار ہے۔ اس لحاظ سے سورہ فاتحہ قرآن کی اساس ہے کیونکہ یہی سب سے پہلی سورت ہے اور اسی کے مطالب و مقاصد پر پورے قرآن کی تعلیمات کا انحصار ہے۔ پورا قرآن اپنی تعلیمات کے اعتبار سے دنیا و آخرت کے جملہ امور کو سنوارنے کا ضامن ہے اس کی ہدایت بھی دنیا و آخرت کی کلی اصلاح کی غرض سے نازل کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:-

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ ان پر کوئی خوف (طاری) ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(البقرہ، ۲:۳۸)

اگر آپ سورہ فاتحہ کے مضامین کا بنظر غائر جائزہ لیں تو دنیا و آخرت کی اصلاح اور ان کے خوف و غم سے کلی نجات کا طریقہ بھی اس میں مذکور ہے اور ضمانت بھی۔ یہ حقیقت سورہ فاتحہ کی سات آیتوں میں سے ہر ایک پر انہماک کے ساتھ غور و خوض کرنے اور ان کے معانی و معارف میں ڈوب جانے سے منکشف ہو جاتی ہے۔ اس امر کی تفصیل انشاء اللہ سورہ فاتحہ کے مضامین کے بیان میں آئے گی۔

۱۰- سورۃ الحمد ۱۱- سورۃ المناجاۃ ۱۲- سورۃ الشکر

سورہ فاتحہ کے یہ تینوں نام دراصل اس کی ایک انتہائی اہم خصوصیت کی نشاندہی کرتے ہیں اور وہ ہے باری تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی تمجید و توصیف۔

اس سورت کا آغاز چونکہ الحمد سے ہوتا ہے اس لئے اس کا معروف نام سورۃ الحمد ہی ہے۔ حمد کے افتتاحی لفظ کے علاوہ بھی یہ پوری سورت رب کائنات کی توصیف و مناجات پر مشتمل ہے، اس کی مختلف شانوں اور حیثیتوں کے تذکرے سے معمور ہے اور اس کے انعامات و احسانات کے بیان سے لبریز ہے۔ ہر جگہ اس کی رحمت، نعمت اور عطا و ہدایت کا ذکر نظر آتا ہے۔ اس لئے اس سورت کا پڑھنا از خود شکر الٰہی بھی قرار پاگیا کیونکہ کسی دینے والے کی عطا و احسان کے حوالے سے اس کی تعریف کرنا شکر کہلاتا

ہے۔ گویا یہ نام سورہ فاتحہ کے اسلوب بیان پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور اس کی روح بیان پر بھی۔

۱۳۔ سورۃ الصلوٰۃ

چونکہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز میں واجب ہے اور اسے ترک کرنے سے نماز کامل نہیں ہو سکتی، جیساکہ پہلے احادیث کے ذریعے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت اور ناگزیریت کی بناء پر اسے سورۃ الصلوۃ کا لقب دے دیا گیا۔ قیام نماز میں دوسری سورتوں اور آیتوں کو تو بدل بدل کر پڑھا جا سکتا ہے لیکن سورہ فاتحہ کا بدل کوئی سورت نہیں بن سکتی کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جس نے فاتحہ الکتاب نہ پڑھی اس کی نماز پوری نہ ہوئی"۔

یہ سورت چونکہ نماز کا اس قدر اہم جزو تھا کہ اس کے اصلاً یا حکماً شامل ہوئے بغیر نماز پایہ تکمیل کو ہی نہیں پہنچ سکتی تھی، اس لئے اسے مجازاً کل کا نام دے دیا گیا اور ویسے بھی سورہ فاتحہ نماز کے جملہ فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کی روح ہے۔ جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے وہی نماز کی معراج ہے کہ بندے کے دل میں اپنے بندہ ہونے اور اس ذات ستودہ صفات کے رب اور خالق و مالک ہونے کا احساس ہو جائے اور وہ خود کو عاجز و بے بس سمجھ کر اس کی بارگاہ میں دامن مراد پھیلا دے اور جبین نیاز جھکا دے تو یہی حاصل نماز ہے اور اسی تعلیم کا نام سورہ فاتحہ ہے۔

۱۴۔ سورۃ التفویض

اپنے امور کی انجام دہی کسی کو سونپ دینا "تفویض" کہلاتا ہے۔ یہ توکل کا سب سے بڑا درجہ ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں ملتا ہے:۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ (المؤمن، ۴۰:۴۴)

سورہ فاتحہ میں حمد و ثنائے باری تعالیٰ کے بعد اس کی عبادت کا ذکر اس امر کی

[illegible]
مستعان سمجھتے ہوئے اس سے مدد طلب کرنا اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ رب ذوالجلال کو کافی و وافی کارساز تصور کر کے اپنے جملہ امور حیات کا انجام اس کے سپرد کر دے۔ اسی کو تفویض کہتے ہیں اور یہی عبادت و استعانت کی روح ہے۔ سورہ فاتحہ سے نہ صرف تفویض کا مفہوم حکماً ثابت ہے بلکہ اس کا اظہار صراحت کے ساتھ بھی کر دیا گیا ہے۔ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ چلا) کے دعائیہ کلمات اسی عزم و ارادے پر دلالت کرتے ہیں۔ جب انسان ہر قدم پر بار بار دست بستہ عاجزی و نیاز مندی کے ساتھ اپنے خالق و مالک سے سیدھے راستے کی التجا کرتا ہے تو گویا وہ اس امر کا اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ اے اللہ! میرا کام سوچ بچار کرنا اور جدوجہد جاری رکھنا تھا' سو وہ میں کر رہا ہوں۔ اب مجھے صحیح راہ پر چلنے کی توفیق دینا اور انجام کار منزل مقصود تک پہنچانا تیرا کام ہے۔ پس تو میری رہنمائی فرما۔ میں اپنی فکری سلامتی بھی تجھ سے مانگتا ہوں اور اپنے عمل کی صحت و پختگی بھی تجھ سے مانگتا ہوں۔ راہ راست کی نشاندہی بھی تو کرا اور مطلوب و مقصود تک رسائی بھی تو عطا کر۔ یہ سب کچھ توکل اور تفویض ہے جو پوری سورت کا ماحصل ہے۔ تفویض دراصل ایسے زندہ توکل کو کہتے ہیں جس سے انسانی زندگی میں جمود اور تعطل بھی پیدا نہیں ہوتا اور ذات حق پر کامل بھروسہ بھی قائم و دائم رہتا ہے۔ توکل سے مراد حرکت کو سکون میں نہیں بلکہ کامیابی اور نتیجہ کے یقین کے ساتھ سکون کو حرکت میں بدلنا ہے اور یہی سورۃ التفویض کی بنیادی تعلیم ہے۔

۱۵- سورۃ الدعا ۱۶- سورۃ السؤال ۱۷- سورۃ تعلیم المسئلہ

سورہ فاتحہ کے یہ تینوں نام ایک ہی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں اور وہ اس سورت کی ترتیب آیات سے مترشح ہوتا ہے۔ اس کو سورہ دعا' سورہ سوال اور سورہ تعلیم المسئلہ کے نام سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ سورت بندوں کو آداب دعا اور بارگاہ ربوبیت میں سلیقہ سوال سکھاتی ہے۔ رب جواد و کریم سے مانگنے کا وہ کونسا طریقہ ہے جس کی تعلیم سورہ فاتحہ نے دی ہے؟ اس کا علم اس سورت کی سات آیات اور ان

کے مضامین کی ترتیب [illegible] سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیات [illegible] اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ان میں اس کی محمودیت' الوہیت' ربوبیت' رحمانیت' رحیمیت اور مالکیت کا تذکرہ ہے۔ گویا انسان کی لب کشائی رب کائنات کی عظمتوں کے ذکر سے ہوتی ہے۔ اس طرح ذات حق کی تسبیح و ستائش کے بعد اب بندہ اپنے آقا سے اپنا نیاز مندانہ تعلق عرض کرنے لگتا ہے اور اس تعلق کے حوالے سے اپنی عاجزی' بے کسی اور مسکنت کا بیان کرتا ہے۔ چوتھی آیت **اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ**O اسی مقام کو واضح کر رہی ہے۔ یہاں بندہ اس کی بارگاہ میں پہنچ کر خشوع و خضوع اور تذلل و تضرع کے ساتھ اپنی جبین نیاز جھکا دیتا ہے۔ اس کی عظمت کے مقابلے میں اپنی بندگی' اس کی رحمت کے مقابلے میں اپنی پریشان حالی' اس کی مالکیت کے مقابلے میں اپنی غلامی' اس کی مغفرت کے مقابلے میں اپنی حاجتمندی اور اس کے لطف و کرم کے مقابلے میں اپنی احسان مندی۔ الغرض اپنے اور اپنے رب کے درمیان اس تعلق کو بیان کرلینے کے بعد اب وہ گڑگڑاتے ہوئے' آہ و زاری کرتے ہوئے اور اس کی بے پایاں رحمتوں پر نظر امید رکھتے ہوئے اس کی بارگاہ انعام و عطا میں اپنا دامن سوال پھیلا دیتا ہے۔ اس کے سامنے اپنی آرزو اور مدعا عرض کرتا ہے اور اس سے اس کے رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہے۔ یہ آخری مرحلہ سورہ فاتحہ کی پانچویں سے ساتویں آیت تک ہے۔ چنانچہ وہ ذات جو ہر عظمت اور کبریائی کی حقدار ہے' اپنے بندے کو اس حال اور اس قرینے سے مانگتا دیکھ کر اپنی عطاؤں اور نعمتوں کی بارش کر دیتی ہے۔ سورہ فاتحہ کا یہ اسلوب بیان بندوں کو اپنے آقا و مولا سے مانگنے کا مؤثر طریقہ سکھا رہا ہے کہ بندہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف اور حمد و ثناء کرے' پھر عاجزی اور مسکنت کے حوالے سے ذات حق کے ساتھ اپنے تعلق بندگی کو بیان کرے اور آخر میں اس سے اپنا مدعا عرض کرے۔ دربار جتنا عظیم ہو آداب اسی قدر زیادہ ہوتے ہیں:۔

عدم یزداں سے اتنا بے تکلف
بڑا دربار ہے' آہستہ بولو

(عدم)

سورہ فاتحہ کے بیان کی یہ تقسیم حدیث نبوی ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

قسمت الصلاۃ بینی و بین عبدی نصفین فنصفہا لی و نصفہا لعبدی و لعبدی ما سأل

(جامع الترمذی ۲: ۱۱۹)

میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نماز کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ آدھی میرے لئے ہے اور آدھی میرے بندے کے لئے اور میرے بندے کو وہی ملے گا جو اس نے مانگا۔

پھر حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے اس کی مزید وضاحت یوں فرمائی کہ جب بندہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے **الحمد للہ رب العلمین** کہتا ہے تو باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ **حمدنی عبدی** (میرے بندے نے میری حمد کی) جب بندہ **الرحمن الرحیم** کہتا ہے تو ارشاد الٰہی ہوتا ہے **اثنی علیّ عبدی** (میرے بندے نے میری (مزید تعریف کی) جب بندہ **مالک یوم الدین** کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے **مجدنی عبدی** (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) یہ بھی ارشاد ہوتا ہے **فوض الی عبدی** (میرے بندے نے اپنا معاملہ میرے سپرد کردیا) اس کے بعد جب بندہ **ایاک نعبد و ایاک نستعین** ○ کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے۔ **ھذا بینی و بین عبدی** (یہ بات میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے) اور جب بندہ **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضالین** ○ کہتا ہے تو ندا آتی ہے **ھذا لعبدی و لعبدی ما سأل** (یہ حصہ خالصتاً میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کو وہی ملے گا جو اس نے مانگا۔

(ترمذی ۲: ۱۱۹)

آیات متذکرہ کی جو تقسیم حدیث مبارکہ سے ثابت ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیات خالصتاً اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ہیں درمیانی (چوتھی) آیت اللہ اور بندے کیلئے مشترک ہے اور آخری تین آیات صرف بندے کی ذات کیلئے ہیں یہی ادب سوال

اور اھدنا طلب ہے جو اس سورت کے اسلوب بیان سے عیاں ہوتا ہے کہ پہلے ثناء ہو پھر عاجزی کے ساتھ طلب تو پھر بندہ ذات حق کی عطا سے بہرہ یاب ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کو "سورۃ الدعا" اور "سورۃ السؤال" کہتے ہیں۔

۱۸- سورۃ الکافیہ

سورہ فاتحہ کو **الکافیہ** اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ ہر ایک کا بدل ہو کر کفایت کر سکتی ہے لیکن کوئی اور سورت اس کی جگہ پر کافی نہیں ہو سکتی۔ اس حکم کی بنیاد یہ حدیث نبوی ﷺ ہے جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:۔

ام القران عوض عن غیر ھا ولیس غیر ھا عوضاً عنھا

سورہ ام القرآن ہر ایک سورت کا عوض ہے لیکن کوئی اور سورت اس کا عوض نہیں۔ (تفسیر کبیر، ۱:۱۷۶)

الکافیہ کی وجہ تسمیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ سورت قرآن حکیم کے جملہ علوم و ہدایات، معارف و مطالب اور دین اسلام کے تمام بنیادی مقاصد و تعلیمات کی روح ہے اور جامعیت کے اعتبار سے کافی ہے۔ دین حق کا کوئی اساسی مسئلہ ایسا نہیں جس کا عطر اور خلاصہ سورہ فاتحہ میں مندرج نہ ہو، مستزاد یہ کہ عرفاء کاملین کے نزدیک شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کے مراتب عالیہ میں سے کوئی مرتبہ اور درجہ ایسا نہیں جس کی تعلیم سورہ فاتحہ میں نہ دی گئی ہو۔ لیکن:۔

رموز سر دل بے دل چہ داند

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:۔

فاتحۃ الکتاب تعدل ثلثی القرآن

فاتحہ الکتاب اجر و ثواب کے لحاظ سے دو تہائی قرآن کے برابر ہے۔

حضرت ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔

اعظم سورۃ من القرآن الحمد للہ رب العلمین (صحیح البخاری، ۲:۷۴۹)

قرآن کی سب سے عظیم سورت، سورۃ الحمد ہے۔

[illegible] انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

افضل القرآن الحمد للہ رب العلمین
(صحیح البخاری، ۲: ۷۴۹)

قرآن کی سورتوں میں سے اجر و ثواب کے لحاظ سے سب سے **افضل سورۃ الحمد** ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے جو تلاوت کی جاتی ہے، سورہ فاتحہ اس کا جزو لاینفک قرار دیا گیا ہے۔ اجر و ثواب کی کفایت کی بناء پر پورے عمل کو مجازاً فاتحہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ حدیث رسول ﷺ کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ سورہ فاتحہ کی ایک مرتبہ تلاوت کرنا دو تہائی قرآن کی تلاوت کے حکم میں ہے۔ اسی طرح یہ بھی احادیث صحیح سے ثابت ہے کہ ایک مرتبہ سورہ اخلاص کا پڑھنا ایک تہائی قرآن کی تلاوت کا ثواب عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ایک ایک مرتبہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کا ملا کر پڑھنا ثواب کے اعتبار سے پورے قرآن کی تلاوت کے حکم میں ہو گا۔ بنا بریں بزرگوں کے معمولات کے مطابق ایصال ثواب کے لیے کم از کم ایک ایک مرتبہ فاتحہ اور اخلاص کی تلاوت مستحب سمجھی جاتی ہے تاکہ مرحوم کی روح کو حکماً پورے قرآن کی تلاوت کا ثواب پہنچ جائے۔ اس امر کی تائید حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث نبوی ﷺ سے بھی ہوتی ہے۔ جسے امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "**انوار التنزیل**" میں نقل کیا ہے:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال: ان القوم لیبعث اللہ علیھم العذاب حتماً مقضیاً فیقرأ صبی من صبیانھم فی الکتاب الحمد للہ رب العلمین فیسمع اللہ تعالی فیرفع عنھم بذلک العذاب اربعین سنۃ
(الکشاف، ۱: ۱۹) (تفسیر کبیر، ۱: ۱۷۸)

اللہ تعالیٰ بعض لوگوں پر اپنے فیصلے کے بعد عذاب قائم فرمانا چاہے گا۔ بعد ازاں ان کے بچوں میں سے کوئی بچہ قرآن حکیم کی سورۃ الحمد پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ وہ سن کر اس کے بدلے ان سے چالیس سال تک عذاب دور فرما دے گا۔

اس حدیث سے یہ امر بھی طے پا گیا کہ زندہ لوگوں کے اعمال صالحہ سے مرحومین کو یقیناً فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی کا نام ایصال ثواب ہے۔ یہ حکم صحاح ستہ و دیگر کتب حدیث کی متعدد صحیح روایات سے کئی صورتوں میں ثابت ہے۔ اس حدیث سے یہ نکتہ بھی ثابت ہوا کہ سورہ فاتحہ اپنی تاثیر و برکت اور اجر و ثواب کے لحاظ سے اس قدر کثیر الفوائد ہے کہ اس کا نام سورۃ الکافیہ عین مقتضائے حکمت ہے۔

۱۹۔ سورۃ الوافیہ

یہ لفظ وفا سے مشتق ہے۔ اس کا معنی پورا کرنا ہے۔ سورہ فاتحہ کا نام الوافیہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کا نصف پڑھنا جائز نہیں۔ اسے ہر جگہ پورا ہی پڑھا جائے گا۔ مثلاً دیگر وہ سورتیں، جن کی آیات کم از کم چھ یا اس سے زائد ہوں تو انھیں نماز کی دو رکعتوں میں نصف نصف کر کے پڑھا جا سکتا ہے لیکن سورہ فاتحہ کے لیے اجازت نہیں کہ اسے نصف نصف کر کے دو رکعتوں میں مکمل کیا جائے۔ یہ تصریح امام ثعلبی ؒ نے کی ہے جسے امام فخرالدین رازی ؒ نے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ اجر و ثواب کی کثرت بھی الوافیہ کی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہے۔

۲۰۔ سورۃ الشفاء ۲۱۔ سورۃ الشافیہ

یہ دونوں نام بھی ارشادات نبوی پر مبنی ہیں۔ دارمی ؒ نے "مسند" اور بیہقی ؒ نے "شعب الایمان" میں اسناد صحیح سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔

فاتحۃ الکتاب شفاء من کل داءٍ

فاتحۃ الکتاب ہر مرض کے لیے شفاء ہے۔

(تفسیر کبیر، ۱:۱۷۶) (ابن کثیر، ۱:۸)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا اخبرک باخیر سورۃ نزلت فی القرآن قلت بلی یا رسول اللہ صلی

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں قرآن کی ایک اعلیٰ اور افضل سورت کے بارے میں نہ بتاؤں؟ میں

اللہ علیہ و سلم قال فاتحۃ الکتاب و احسبہ قال فیھا شفاء من کل داء
(ابن کثیر، ۱: ۱۰)

نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرور فرمائیے۔ آپ نے فرمایا وہ فاتحۃ الکتاب ہے اور میں اسے کافی سمجھتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ہر مرض کے لئے دوا ہے۔

سعید بن منصور اور بیہقی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔

فاتحۃ الکتاب شفاء من السم
(تفسیر کبیر، ۱: ۱۷۸)

فاتحۃ الکتاب زہر کے لئے شفاء ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ محض ارشادات ہی نہ تھے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سورہ فاتحہ کو آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق فی الواقعہ شفاء سمجھتے تھے اور کئی امراض کا علاج بھی اس سورت کے ذریعے کرتے رہے۔ صحیح مسلم، سنن نسائی اور بعض دیگر کتب حدیث میں منقول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سانپ اور بچھو کے کاٹے پر اور مجنون اور اہل صرع (یعنی مرگی کے مریض) پر سورت فاتحہ پڑھ کر دم کرتے تھے اور مریض اسی وقت تندرست ہو جاتا تھا۔ بزرگوں نے اب بھی مختلف امراض کے لئے سورہ فاتحہ کو مخصوص اوقات میں یا مخصوص تعداد میں پڑھ کر دم کرنے کی وہی تاثیر بیان کی ہے۔ دراصل یہ تاثیرات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عالم اسباب کے اندر روحانی اسباب کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس طرح مختلف معاملات میں حصول مقاصد کے لئے باری تعالیٰ نے مادی اسباب و ذرائع پیدا کئے ہیں، جن کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی علت و معلول کے تجزیئے سے انسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اسی طرح اس نے اپنی قدرت کاملہ کے خرق عادت کے پہلو کے ظہور کے لئے روحانی اور غیر مادی اسباب و ذرائع بھی پیدا فرمائے ہیں۔ جن کی تاثیر کا ادراک اور فہم صرف حجابات کے مرتفع ہونے سے ہوتا ہے۔ مادی پیمانوں کے ذریعے نہیں۔ یہ معاملات محض روح کے حیطہ ادراک میں آتے ہیں، عقل کے بس میں نہیں۔ لہٰذا ایسے مسائل پر عقل کا فتویٰ معتبر نہیں ہو سکتا۔ اس پر بسم

اللہ کی تفسیر میں اسباب سے استفادہ و استمداد کے عنوان کے تحت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مزید وضاحت کے لئے وہ مقام ملاحظہ فرمائیں۔ اس امر کی تائید خود قرآن و سنت کے لاتعداد دلائل صریحہ سے ہوتی ہے۔ انشاء اللہ ان کا ذکر مع ضروری **توضیحات** اپنے اپنے موقع پر کر دیا جائیگا۔

۲۲- سورۃ الرقیہ

رقیہ **رقی** سے مشتق ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں تریاق کے لئے بولا جاتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سفر میں تھے دریں اثناء کسی عورت نے ان سے سانپ کے ڈسے کے لئے تریاق کے بارے میں دریافت کیا۔ جس پر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو وہ شخص وہیں ٹھیک ہوگیا۔ پھر یہ ماجرا حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ماکان یدریہ انہا رقیۃ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سورت تریاق ہے؟ (صحیح بخاری، ۲: ۷۴۹)

اس لحاظ سے یہ نام بھی خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجوزہ ہے۔

۲۳- سورۃ الواقیہ

یہ **وقی** سے مشتق ہے جس کا معنی ہے:۔ **صانہ سترہ عن الاذی** یعنی کسی کو تکلیف اور مصیبت سے محفوظ کرنا اور چھپالینا۔

سورہ فاتحہ کو **الواقیہ** کہنا اس اعتبار سے ہے کہ یہ سورت اپنے خصوصی اثرات و برکات کے باعث انسان کو شدائد و مصائب سے بچالیتی ہے۔ طبرانی کی ایک روایت سے جو سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اس سورت کا تعوذ کی تاثیر کا حامل ہونا ثابت ہے۔ یعنی اس کی تلاوت سے انسان شیطانی فتن و شرور اور مصائب و آلام سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

اذا وضعت جنبک علی الفراش و	اگر تم بستر پر دراز ہوتے وقت سورہ فاتحہ
قرأت فاتحۃ الکتاب و قل ھو اللہ	اور سورہ اخلاص پڑھ لیا کرو تو سوائے
احد فقد امنت کل شئ الا الموت	موت کے تم ہر شے سے محفوظ و مامون
(ابن کثیر'۱:۱۲)	ہو جاؤ گے۔

اسی تاثیر کے باعث اس کا نام الواقیہ رکھا گیا ہے۔

علی ہذا القیاس یہ سورہ فاتحہ کے مختلف اسماء تھے جن سے اس کے متعدد فضائل و برکات اور کمالات و تاثیرات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ دیگر کسی بھی سورت کے اس قدر نام بیان نہیں کیے گئے۔ یہی پہلو اس کی انفرادیت اور اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ سورت چونکہ تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف اور جملہ فوائد و مقاصد کی جامع اور منبع ہے' اس لئے اسی کو قرآن کی افتتاحی سورت ہونے کا شرف عطا کیا گیا۔

باب-۲

سورہ فاتحہ کا نزول
اور
حقیقت اولیت

اس سے قبل سورہ فاتحہ کے اسماء اور ان کی معنوی خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی جاچکی ہیں اور ان ہی اسماء کے حوالے سے سورت کے خصوصی فضائل و برکات پر بھی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ اب اس کے نزول کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ترتیب کتابی اور ترتیب نزولی میں فرق

قرآن مجید کی ترتیب کتابی یا ترتیب تدوینی کے اعتبار سے سورہ فاتحہ سب سے پہلی سورت ہے اور اسی سے عبارت قرآنی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس ترتیب میں کسی سورت کا مقام اس کے زمانہ یا وقت نزول کی نشاندہی نہیں کرتا۔ جیسے کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے قرآن مجید کی ترتیب کتابی اس کی ترتیب نزولی سے مختلف ہے۔ کتابی ترتیب میں کسی سورت یا آیت کا مقدم و مؤخر ہونا اس کے نزول کے تقدم و تأخر پر دلالت نہیں کرتا۔ نزول کی ترتیب وقتی اور ہنگامی تھی جب کہ کتابی ترتیب دائمی و مستقل ہے۔ لیکن یہاں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن مجید کی دونوں ترتیبیں توقیفی اور الہامی ہیں۔ کتابی ترتیب محض قیاس و اجتہاد سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کی اطلاع بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ جبرئیل علیہ السلام باقاعدہ طور پر کی جاتی تھی اور آپ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمادیتے۔ چنانچہ اسی کتابی ترتیب کے مطابق خود آنحضرت ﷺ اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن حکیم حفظ بھی کیا اور دو سال تک جرائیل امین علیہ السلام نے رمضان المبارک میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ پورے قرآن کا دور کیا۔ جس سے اس کتابی ترتیب کے توقیفی اور الہامی ہونے کا قطعی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس حقیقت پر متعدد احادیث صحیحہ اور سنن و آثار شاہد ہیں جن کی تفصیل آپ "مقدمہ" میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ دونوں ترتیبوں کے فرق کو عملاً یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ نزول قرآن کا مدنی دور صاف ظاہر ہے

مکی دور کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مدنی سورتیں مکی سورتوں سے باعتبار نزول مؤخر ہیں۔ لیکن سورہ فاتحہ کے بعد باترتیب البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدہ ہیں۔ یہ سب مدنی سورتیں ہیں یعنی آخری دور میں نازل ہوئی ہیں لیکن کتابی ترتیب میں انہیں پہلے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح آخری پارے کی اکثر مفصّل سورتیں مکی ہیں یعنی نزول میں مقدّم ہیں۔ لیکن کتابی ترتیب میں مؤخر واقع ہوئی ہیں۔ مزید برآں جن آیات سے سلسلہ وحی کا آغاز ہونا منقول ہے نہ وہ کتابی ترتیب میں سب سے پہلی آیات ہیں اور نہ جن آیات پر سلسلہ وحی کا ختم ہونا منقول ہے وہ کتابی ترتیب میں سب سے آخری ہیں۔ لہٰذا ان شہادتوں کی روشنی میں یہ امر واضح ہو گیا کہ سُوَر قرآن کا کتابی ترتیب میں پہلے یا بعد میں جگہ پانا ان کے زمانہ نزول کا تعین نہیں کر سکتا۔ بنا بریں سورہ فاتحہ (جو کتابی ترتیب میں سب سے پہلی سورت ہے) کے نزول کے بارے میں ہمیں احادیث کی مدد سے طے کرنا ہو گا کہ یہ کس دور میں نازل ہوئی۔

سورہ فاتحہ کا زمانہ نزول

اس مسئلہ پر علماء کے تین اقوال ہیں:۔

۱:۔ یہ سورت مکی دور میں نازل ہوئی۔

۲:۔ مدنی دور میں نازل ہوئی

۳:۔ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ پہلے مکی دور میں اور دوسری مرتبہ مدنی دور میں۔

قول اول:۔

سورہ فاتحہ کا مکی ہونا مذہب مختار ہے۔ احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ کے علاوہ خود قرآن مجید اس امر کی تائید کرتا ہے۔ "سورۃ الحجر" بالاتفاق مکی سورت ہے۔ اس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ○	اور بیشک ہم نے آپکو بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں (یعنی سورۃ فاتحہ)

(الحجر ۱۵:۸۷) اور بڑی عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے۔

سبعا من المثانی سے مراد جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے متفقہ طور پر سورہ فاتحہ ہے۔ کیونکہ یہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور یہی وہ سورت ہے جو بار بار ہر نماز میں دہرائی جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صراحت کے ساتھ یہ نام اسی سورت کا بیان فرمایا۔ گویا آیت متذکرہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کو سورہ فاتحہ عطا کی ہے۔ چنانچہ "سورہ حجر" کی یہ آیت جو مکہ میں نازل ہوئی اس بات کی قطعی شہادت مہیا کر رہی ہے کہ سورہ فاتحہ اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ بایں وجہ اس سورت کا مکی ہونا ہی قول صحیح قرار پاتا ہے۔ امام ثعلبیؒ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:۔

نزلت فاتحة الکتاب بمکة من کنز تحت العرش (اسباب النزول: ۱۰)

فاتحۃ الکتاب مکہ میں نازل ہوئی (اور) یہ عرش کے نچلے خزانے سے نازل کی گئی۔ (تفسیر کبیر' ۱:۱۷۷)

امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اکثر علماء کا اتفاق اسی قول پر ہے۔ واحدی رحمہ اللہ علیہ نے "اسباب النزول" میں اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الاتقان" میں اسی امر کی تائید کی ہے۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ علیہ' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ علیہ اور اکثر متقدمین و متاخرین کا بھی یہی مذہب ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ ابن عباس' ابوالعالیہ' قتادہ' ابو میسرہ' حسن رضی اللہ عنہما' اور دیگر صحابہ و تابعین بھی اسی موقف کے قائل ہیں۔

قول دوم:۔ بعض علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سورہ فاتحہ مدنی ہے۔ ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ' مجاہد' عطا بن یسار اور زہری وغیرہم سے یہ رائے منقول ہے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ علیہ نے مجاہد سے حضرت ابو ہریرہ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

ان ابلیس رن حین انزلت فاتحة الکتاب و انزلت بالمدینة

جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی تو شیطان چیخنے لگا اور یہ سورت مدینہ میں نازل کی گئی۔

(الاتقان' ۱:۴۷)

لیکن امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ممکن ہے کہ آخری جملہ جو سورہ فاتحہ کے مدینہ مین نازل ہونے سے متعلق ہے مجاہد کا اپنا قول ہو۔ یہ بات حضرت ابو ہریرہ نے نہ فرمائی ہو"۔

امام واحدی" حضرت مجاہد" کے اس قول کی بابت رقم طراز ہیں:۔

لانہ تفرد بھذا القول والعلماء علی خلافہ و مما یقطع بہ علی انھا مکیۃ قولہ تعالی: لَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِیْ۔ الایۃ (اسباب النزول:۱۱)

کیونکہ یہ صرف حضرت مجاہد" کی رائے ہے۔ جب کہ تمام علماء اس کے خلاف موقف رکھتے ہیں (یعنی اس سورت کو مکی سمجھتے ہیں) اور اس سورت کا مکی ہونا باری تعالٰی کے اس ارشاد سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم نے آپ کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیات عطا کر دیں۔

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ "**سبعا من المثانی**" سے مراد متفقہ طور پر سورہ فاتحہ ہے۔ بعض دیگر علماء کے اقوال اگر اس سورت کے مدنی ہونے کی بابت ملتے ہیں تو وہ بھی شاید حضرت مجاہد کے قول سے ہی متاثر ہوئے ہوں گے۔

قول سوم:۔

بعض علماء نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ سورہ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ پہلی بار مکہ میں اور دوسری بار مدینہ میں، جب بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ یہ قول مذکورہ بالا دونوں اقوال کے درمیان تطبیق کی بہترین صورت ہے۔ علامہ زمخشری رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"**وقیل مکیۃ و مدنیۃ لانھا نزلت بمکۃ مرۃ و بالمدینۃ اخرای**" **(الاتقان'۱:۴۷)**

یہ بھی کہا گیا کہ سورۃ فاتحہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی کیونکہ یہ ایک بار مکہ میں اور دوسری بار مدینہ میں نازل ہوئی۔

اولیت تنزیل کا مسئلہ

اولیت تنزیل کے مسئلے سے ہماری مراد یہ ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے کا شرف کس سورت کو حاصل ہوا؟ سابقہ بحث سے یہ امر تو اچھی طرح متعین ہو گیا کہ سورت فاتحہ مکی دور میں نازل ہوئی اور اگر مدینہ میں نازل ہونے والے قول کی طرف التفات کیا بھی جائے تو وہ یقیناً اس کے دوسری مرتبہ کے نزول سے متعلق ہو گا۔ کیونکہ سورہ حجر بلا اختلاف مکی سورت ہے اور اس کی ایک آیت میں سورہ فاتحہ کے نازل ہو چکنے کی بات کی گئی ہے۔ جس سے سورہ فاتحہ کا بہرصورت سورہ حجر کی اس آیت سے پہلے نازل ہونا متحقق ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کونسی سورت نازل ہوئی؟ اس لیے کہ اولیت تنزیل بھی بلا شک و شبہ ایک عظیم فضیلت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ فضیلت کس سورت کے حصے میں آئی؟ یعنی رب ذوالجلال نے اپنے احکام و تعلیمات کے افشاء و ابلاغ کے لیے سب سے پہلے کس سورت کو منتخب فرمایا کیونکہ یہ انتخاب اس سورت کی عظمت' حیثیت اور اہمیت کو اجاگر کرے گا اور اس سے پتہ چلے گا کہ وہ کونسا سبق ہے جسے خالق کائنات نے انسانیت کی اصلاح کے حرف آغاز کے طور پر چنا جیسے کہ سورہ فاتحہ کے اسماء اور ان کی معنوی خصوصیات کے باب میں **الفاتحہ** اور **فاتحۃ الکتاب** کے عنوانات کے تحت بیان کیا جا چکا ہے کہ یہی سورت تدوین اور تنزیل دونوں ترتیبوں میں اولیت کا شرف رکھتی ہے۔ اسی سورت کو انسان کے درس حیات میں پہلے سبق کا درجہ عطا کیا گیا اور اسی کو ابدی تعلیمات اور الہامی ہدایات کی عظیم کتاب کا پہلا باب قرار دیا گیا۔ اس کی اولیت اس کے نام (فاتحہ جو **فتح** سے مشتق ہے) سے ہی عیاں ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اس مسئلہ پر تحقیقی غور و خوض کیا جائے تو محدثین و مفسرین کے چار اقوال سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا ان کی حقیقت کو سمجھ کر ہی اس مسئلہ پر کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

اولیت تنزیل کی بابت مختلف اقوال

اس موضوع پر جو اقوال نظر سے گزرے ہیں درج ذیل ہیں:۔

قول اول

پہلے قول کے مطابق نزول وحی کا آغاز سورہ اقراءؑ سے ہوا۔ امام بخاریؒ نے کیف کان بدء الوحی (وحی کس طرح شروع ہوئی) کے عنوان سے "الجامع الصحیح" میں ایک باب قائم کیا ہے۔ جس میں وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ پر وحی کا سلسلہ رویائے صادقہ سے شروع ہوا۔ چنانچہ جو کچھ آپ ﷺ خواب میں رات کو دیکھتے وہی دن کی روشنی کی طرح عیاں ہو جاتا۔ پھر آپ کو خلوت اور گوشہ نشینی محبوب ہو گئی۔ آپ اکثر غار حراء میں تشریف لے جاتے۔ راتیں بھی وہیں بسر فرماتے اور اس میں عبادت کرتے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ پر اسی حالت میں نور حق ظاہر ہو گیا۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:۔

قالت اول ما بدی بہ رسول اللّٰہ ﷺ من الوحی الرویا الصادقۃ فی النوم فکان لا یری رویا الا جاءت مثل فلق الصبح ثم حبب الیہ الخلاء وکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیہ و ھو التعبد اللیالی ذوات العدد قبل ان ینزع الی اھلہ و یتزود لذلک ثم یرجع الی خدیجۃ فیتزود لمثلھا حتی جاءہ الحق و ھو فی غار حراء فجاءہ الملک فقال اقرا فقال ما انا بقاری .... فقال اقراء باسم ربک الذی خلق

(صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی۔ آپ جو خواب میں دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا۔ پھر آپ خلوت پسند ہو گئے اور غار حراء میں جانے لگے اور وہاں کئی کئی راتیں مصروف عبادت رہتے گھر واپس آنے سے پہلے (یہی معمول رہتا تھا) پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لاتے اور اتنی ہی راتوں کا زاد سفر لے کر واپس تشریف لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس حق آگیا جبکہ آپ غار حراء میں تھے یعنی فرشتے نے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر کہا پڑھئے!

کہا میں
پڑھنے والا نہیں ہوں------ پھر اس نے
کہا پڑھو! اپنے رب کے نام سے جس
نے پیدا کیا۔

جیسا کہ حدیث مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غار حراء میں فرشتہ حضور ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ تک پہلی وحی کے طور پر **سورہ اقرأ** کی ابتدائی پانچ آیات پہنچا دیں۔ (حدیث طویل ہے لیکن متعلقہ حصہ پیش کر دیا گیا ہے) آپ نے یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ اس حدیث میں آغاز وحی سے قبل حضور علیہ السلام کا غار حراء میں کئی کئی دن ٹھہرنا اور عبادت کرنا مذکور ہے۔ آئمہ و محدثین کا اجماع ہے کہ یہ عبادت ملت ابرہیمی کے مطابق زیادہ تر فکر و مراقبہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ گویا آپ پر مسلسل یاد الٰہی میں محویت' انہماک اور استغراق کی کیفیت طاری رہتی اور یہ حالت نور حق کے ظاہر ہونے تک جاری رہی۔ آنحضرت ﷺ کی اسی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا:۔

وَ وَجَدَکَ ضَالاً فَھَدٰی (الضحیٰ' ۹۳:۷)

اور اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ و گم پایا تو اس نے مقصود تک پہنچا دیا۔

اس سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نزول وحی سے پہلے بھی حضور راہ حق سے بے خبر اور ناواقف نہ تھے۔ بلکہ آپ کو معرفت الٰہی حاصل تھی۔ حضور ﷺ حسن الوہیت کے عشق میں گرفتار تھے اور اسی کی یاد میں کئی کئی دن فکر و مراقبے کی حالت میں گزار دیتے۔ شہر کی رونقوں اور گھر بار کی جلوتوں کو چھوڑ کر دور ویرانے میں غار حراء کی خلوت کو محبوب حقیقی کی یادہی کے لیے تو منتخب فرمار کھا تھا۔ اس کے سوا اور کیا تھا! یہ سب کچھ جو حدیث میں بیان ہوا ہے آگہی اور باخبری تھی یا ناآگہی اور بے خبری؟ پس آپ کو جس کا انتظار تھا بالآخر وہ شے میسر آگئی۔

اس حدیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ حاکم نے "مستدرک" میں اور بیہقی

نے اپنی "دلائل النبوۃ" میں اسناد صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:-

اول سورۃ نزلت فی القرآن اقرأ باسم ربک (اسباب النزول:۷)

قرآن میں سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت "سورہ اقرأ" ہے۔

اکثر صحابہ و تابعین اور آئمہ و مفسرین کا بھی یہی موقف ہے۔ طبرانی حضرت ابو موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے "سورہ اقرأ" کی تلاوت کر کے فرمایا:-

ھذہ اول سورۃ انزلت علیٰ محمد (اسباب النزول:۷)

یہ پہلی سورت ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔

سعید بن منصورؒ، ابو عبیدؒ، ابن اشتہؒ اور زہریؒ وغیرہم نے اسی قول کی تائید میں مختلف طرق سے متعدد روایات بیان کی ہیں۔

قول ثانی

دوسرے قول کے مطابق سب سے پہلے "سورہ مدثر" نازل ہوئی۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمن سے روایت ہے:-

قال سألت جابر بن عبداللہ: ای القران انزل قبل؟ قال یاایھا المدثر۔ قلت: او اقرأ باسم ربک۔ قال: احدثکم ما حدثنایہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: انی جاورت بحراء شھرا فلما قضیت جواری نزلت فاستبطنت بطن الوادی فنودیت فنظرت امامی و خلفی و عن یمینی و عن شمالی فلم ار احدا ثم نودیت فرفعت راسی و نظرت الی السماء

وہ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ قرآن میں سب سے پہلے کون سی سورت نازل ہوئی؟ انھوں نے جواب دیا کہ **یاایھا المدثر**۔ میں نے کہا یہ **یااقرأ باسم ربک** انہوں نے جواب دیا کہ میں تمہیں وہی بتا رہا ہوں جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے غار حراء میں ایک ماہ تک خلوت نشینی کی۔ جب وہ عرصہ ختم ہو گیا تو میں وہاں سے نکلا اور وادی کے

فاذا هو يعني جبريل و في رواية فاذا الملك الذي جاء ني بحراء فاخذتني رجفة فاتيت خديجة فامرتهم فدثروني فانزل الله "يايها المدثر قم فانذر"

(بخاری '۲: ۷۳۳)

درمیان سے گزرنے لگا- مجھے پکارا گیا میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہ دیا- اسی طرح تین بار آواز آئی- پھر میں نے سر اوپر اٹھایا اور آسمان کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ جبرئیل ہے- ایک روایت میں ہے کہ یہ وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس غار حراء میں آیا تھا- مجھ پر سخت اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی- میں خدیجہ کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے کپڑا اوڑھا دو- چنانچہ انہوں نے مجھے چادر اوڑھا دی- اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی- "اے چادر اوڑھنے والے پیارے! اٹھ' غافل اور گمراہ قوم کو ڈر سنا دے"-

اس حدیث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے "سورۂ مدثر" نازل کی گئی-

قول ثالث

تیسرے قول کے مطابق سب سے پہلے **بسم الله الرحمن الرحیم** نازل ہوئی- امام واحدیؒ نے حضرت عکرمہؒ اور حسنؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

اول ما نزل من القرآن بسم الله الرحمن الرحيم (اسباب النزول:۹)

قرآن میں سے جو چیز سب سے پہلے نازل ہوئی وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے-

امام ابن جریرؒ بطریق ضحاک حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں:-

اول ما نزل جبريل على النبي

سب سے پہلی چیز جو جبریل لیکر نبی اکرم

ﷺ قال یا محمد استعذ ثم قل بسم اللہ الرحمن الرحیم ﷺ پر نازل ہوئے یہ [illegible] کا قول نے کہا۔ اے محمد ﷺ خدا سے پناہ مانگ کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھیے۔ (اسباب النزول:۹)

قول رابع

چوتھے قول کے مطابق سب سے پہلے سورہ فاتحہ نازل ہوئی۔ حضرت علیؓ اور ابو میسرہ، عمرو بن شرجیلؒ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اذا خلوت وحدی سمعت نداء خلفی یا محمد یا محمد ﷺ

جب میں اکیلا ہوتا تھا تو پیچھے سے "اے محمد! اے محمد!" ﷺ ایک آواز سنتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں لبیک کہا تو آواز آئی:-

قل الحمد للہ رب العلمین - حتی بلغ ولا الضالین

کہہ - الحمد للہ رب العلمین - چنانچہ اس نے آخر تک سورہ فاتحہ پڑھ دی۔ (بیہقی، اسباب النزول:۱۰)

امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس کے تمام راوی ثقہ ہیں:- (الاتقان)

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

واکثر المفسرین الی ان اول سورۃ نزلت فاتحۃ الکتاب

اور اکثر مفسرین کا رجحان یہی ہے کہ سب سے پہلے سورہ فاتحہ نازل ہوئی۔

(الکشاف:۱)

مذکورہ بالا اقوال میں سے تیسرا قول جو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے متعلق ہے تو بالکل واضح ہے کہ اس کا تعارض ظاہرا بھی کسی قول سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس بھی سورت کا پہلے نازل ہونا تسلیم کر لیا جائے اس پر "استعاذہ" اور "تسمیہ" کی تقدیم مانع نہیں ہے۔ کیونکہ ہر سورت کا آغاز بسم اللہ سے ہی ہوتا ہے اور بالخصوص یہ قول چوتھے

قول کے جس کے ذریعے سورہ فاتحہ کی اولیت مذکور ہوئی ہے تو عین مطابقت رکھتا ہے کیونکہ روایت میں الحمد سے پہلے بسم اللہ کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ "اس آواز نے بسم اللہ پڑھ کر پوری سورہ فاتحہ کی تلاوت" لہٰذا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو فی الواقع صرف تین اقوال غور طلب ہیں۔ جن کے درمیان تطبیق کے ذریعے حقیقت اولیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔

تطبیق اقوال اور اس کی وجہ

اس وقت ہمارے پیش نظر تطبیق کے لیے درج ذیل تین اقوال ہیں:۔

۱:۔ سب سے پہلے سورہ اقرأ نازل ہوئی۔

۲:۔ سب سے پہلے سورہ مدثر نازل ہوئی۔

۳:۔ سب سے پہلے سورہ فاتحہ نازل ہوئی۔

صحیح تطبیق کی بحث تو بعد میں آئے گی۔ سر دست صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ ان اقوال میں قطعاً کوئی تضاد و تناقض نہیں اور نہ ان میں سے کوئی قول دوسرے قول کی نفی کر رہا ہے۔ بلکہ ہر قول اپنے موقع و محل اور حالت و کیفیت کے اعتبار سے درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کے لحاظ سے اولیت کے تین درجے اور مرحلے تھے جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ ان میں سے ہر قول ایک ایک درجہ اولیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

قول سورہ اقرأ پہلے مرتبہ اولیت پر دلالت کرتا ہے، قول سورہ مدثر دوسرے مرحلہ اولیت پر اور قول سورہ فاتحہ تیسرے درجہ اولیت پر۔

مسئلہ اولیت تنزیل پر مختلف روایات کو دیکھ کر ذہنوں میں یہ گمان پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ تنزیل قرآن کی تاریخ ابتداء غیر واضح، مبہم یا مختلف فیہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ اگر کوئی یہی سمجھتا ہے تو اس کی کم فہمی، کورذوقی اور حقیقت حال سے چشم پوشی یا بے خبری ہے۔ یہ احادیث و روایات نزول قرآن کی نسبت تعین اولیت پر اختلاف و التباس نہیں، بلکہ شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈال رہی ہیں اور اہل فکر کو "اولیت کے

مذاہب ثلاثہ میں امتیاز کرنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اس بحث کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے طالب علموں پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ کئی مسائل پر ایسی احادیث و آثار اور اقوال و روایات ملتی ہیں جن میں ظاہراً اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو حقیقت میں حدیث رسول ﷺ کی ضرورت، اہمیت اور حجیت کا انکار کرنا چاہتے ہیں یا جو اکابرین امت اور عمائدین اسلام کی دینی تحقیقات سے انحراف چاہتے ہیں، ان اختلافات کو سہارا بنا کر امت محمدی ﷺ کے گرانقدر علمی سرمائے کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کے ناقابل اعتبار ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور اسے باعث تشتت و افتراق قرار دیتے ہیں تاکہ جو لوگ سادگی اور خلوص نیت کے ساتھ دین حق کی تفہیم کے آرزومند ہیں، اس بیش بہا علمی خزانے سے لاتعلق ہو جائیں اور ان کی اپنی ذہنی آمریت کی تسکین ہو سکے۔ ایسا اختلاف روایات فی الواقع اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی مسئلے کے مختلف گوشوں، ایک ہی معاملے کے مختلف پہلوؤں اور ایک ہی حقیقت کی مختلف جہتوں اور مرحلوں کو آشکار کر رہا ہوتا ہے۔ مسئلے کی اصل روح اور اس کی ماہیت و کیفیت کو سمجھ کر مختلف اقوال و روایات کے درمیان تطبیق پیدا ہو جاتی ہے جس سے فکر میں نہ صرف وحدت بلکہ صحت، وسعت، اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ نتائج کے اخذ کرنے اور مشاہدے میں سہولت اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ علم اعتدال اور سلامتی سے ہمکنار ہوتا ہے اور یوں حال و مستقبل کا علمی رشتہ عظمت ماضی سے بھی قائم رہتا ہے اور اسے نئی تحقیقات و تخلیقات کے لیے بھی روشنی میسر آتی رہتی ہے۔ چنانچہ صاحب فکر اگر صاحب فن بھی ہو تو وہ کبھی بھی ایسے اختلاف کو احادیث و روایات پر اعتماد ترک کرنے کی بنیاد قرار نہیں دے سکتا۔ بلکہ وہ تو اکثر و بیشتر ان میں حقیقی مطابقت دیکھتا ہے اور مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

عصر حاضر میں احادیث و روایات کے ترک کا رجحان

عصر حاضر میں اختلاف کو بنیاد بنا کر احادیث و روایات کے ترک کرنے کا رجحان صرف دو وجوہ کی بناء پر پیدا ہوا ہے:۔

۱- ایک- فن اور اس کی تفصیلات سے ناواقفیت

۲- دوسری- صاحب فکر کی ذہنی آمریت

آج ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ قرآن اور اسلام کے داعی، مبلغ اور مفکر بہت سے ایسے لوگ ہو گئے ہیں جو فن حدیث و روایت اور اس کی تفصیلات سے بالکل بے خبر ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی بے خبری اور عدم واقفیت کو چھپاتے ہوئے خود کو مفکر تسلیم کروانے کی خاطر ایسے سرمایہ علمی کی افادیت واہمیت سے انکار کر دیں جس کے فن سے وہ خود ناآشنا تھے۔ یہ درست ہے کہ ایسے علوم وفنون کی تفصیلات سے آگاہ ہونا عوام کے بس میں ہے اور نہ ان کے لیے ضروری، مگر خواص اور علماء و مفکرین کے لئے تو فن کی تفصیلات سے آگاہ ہونا ضروری تھا تاکہ وہ اسلام کے پورے سرمایہ علمی سے استفادہ کر کے لوگوں تک عام فہم انداز میں لیکن صحیح اور تحقیقی بات پہنچائیں۔ مستزاد یہ کہ کسی صاحب فکر کی ذہنی آمریت کا یہ بھی تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بات سند تصور نہ کی جائے۔ اور اس مقصد کے لئے اسے یہی بہانہ تراشنا پڑتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ قرآن و حدیث ہے اور جو کچھ پہلے آئمہ اور اکابر اسلام کہتے یا لکھتے رہے ہیں، وہ ان کے ذاتی اقوال تھے لہٰذا کسی کے قول کا قرآن و حدیث سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ پس ان کے اقوال و تحقیقات کو ترک کر دو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسے قرآن و حدیث سمجھ کر تسلیم کر لو۔ اگر وہ مفکر اپنی تحقیق اور نقطہ نظر کو قرآن کہہ کر یا اپنی بات کو قرآن و حدیث کا فکر کہہ کر بیان نہ کرے تو علماء متقدمین و متاخرین کے مقابلے میں اس کی اپنی فکری قیادت مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اپنی ذہنی آمریت کی تسکین کی خاطر ملت اسلامیہ کا علمی و مذہبی رشتہ اسلاف سے منقطع کرایا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کو بجائے قرآن و حدیث سے ماخوذ سمجھنے کے ان کے ذاتی اقوال و آراء قرار دے کر ناقابل التفات باور کرایا جا رہا ہے۔ اس طرح آج کی نوجوان نسل اپنے دینی محسنین سے قلبی تعلق اور لگاؤ پیدا کرنے کی بجائے ان سے بیزار ہوتی جا رہی ہے اور دینی علم و فکر میں آزادی اور روشن خیالی اپنے حدود

[illegible] اسلام کے نام پر [illegible] دے رہی ہے۔

اس لئے اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ اولیت تنزیل کے مسئلے پر پائے جانے والے مختلف اقوال اور احادیث و روایات میں تطبیق کو واضح کر کے "مشتے از خروارے" کے طور پر یہ نمونہ فکر سامنے لایا جائے کہ ظاہری اختلاف روایات سے بھی وحدت فکر تک پہنچا جاسکتا ہے اور اسے بجائے افتراق پر محمول کرنے کے ایک ہی حقیقت کی مختلف سمتیں اور ایک ہی چراغ کی مختلف کرنیں تصور کیا جاسکتا ہے اور مزید یہ کہ اقوال و روایات میں ایسے اختلافات محض فکری انتشار کا نہیں بلکہ حقیقت حال کے آشکار ہونے کا بھی باعث بنتے ہیں۔ صرف ان کی وجہ سے ایسے خزانہ علم کو رد کر دینے کی بجائے اہل فکر کو مزید غور و خوض کر کے علمی حقائق تک رسائی حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ دینی امور میں تمام تفصیلات اور نقطہ ہائے نظر کو سمجھ کر واضح اور ٹھوس رائے قائم کر سکیں۔

مراتب طلوع فجر سے حقیقت اوّلیت کی توضیح

آیئے اب اوّلیت تنزیل کی حقیقت کو سمجھیں تاکہ مختلف احادیث و روایات کا صحیح مفہوم سامنے آسکے۔ یہاں ایک بنیادی نکتہ ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ قرآن کی "پہلی وحی" اور "پہلی سورت" میں نمایاں فرق ہے۔ قرآن مجید کی پہلی سورت وہ ہے جو صاحب قرآن پر سب سے پہلے نازل ہوئی اور پہلی وحی وہ ہے جس سے مطلقاً نزول قرآن کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ اگر ان دونوں میں امتیاز پیش نظر نہ رہے تو مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اولیت ایک اضافی اصطلاح ہے، جس کو صحیح طور پر جاننے کے لئے اس کے مضاف الیہ (یعنی جس کی طرف اس کی اضافت ہو) کو جاننا ضروری ہے۔ مضاف الیہ کو سمجھے بغیر محض اولیت کے لفظ سے کوئی بھی مفہوم پورے طور واضح نہیں ہو سکتا۔ جو چیز تدریج اور ارتقاء کی صورت میں ظاہر ہو اور مرحلہ وار کمال کی طرف بڑھ رہی ہو، پھر اس کے راستے میں کئی ٹھہراؤ اور منزلیں بھی ہوں تو اس صورت میں یقیناً اس کی ابتداء

و آغاز کے بھی کی علامات ہوں گے اور اختتام و انجام کے بھی

جس طرح رات کی تاریکی یکایک ختم نہیں ہو جاتی اور نہ ہی دن کا اجالا آن واحد میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بلکہ آدھی رات ڈھلتی ہے تو سحر نمود کے لیے انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے صبح کی سفیدی عمودی طور پر نیچے سے آسمان کی طرف اٹھتی ہے۔ اسے "صبح کاذب" کہا جاتا ہے۔ یہ طلوع فجر کی علامت ہوتی ہے۔ خود فجر نہیں ہوتی۔ اس وقت سے رات کی ظلمتیں اپنا رخت سفر باندھنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ پھر دوسرا مرحلہ "صبح صادق" کا آتا ہے۔ اب افق پر سفیدی پھیلنے لگتی ہے۔ تاریکی کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور لیلائے سحر بے نقاب ہونے لگتی ہے۔ کچھ دیر تک طلوع فجر کے باوجود جاتی ہوئی رات کے آثار دکھائی دیتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ اجالا شرق و غرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ یہ تمام مراتب و مراحل طلوع فجر کے ہیں جو سورج کے ظہور سے پہلے تکمیل پذیر ہو جاتے ہیں۔ اب اگر اس پورے سلسلہ ارتقاء پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ سفر صبح میں تین مرحلے آئے۔ پہلے مرحلے پر رات کی تاریکی کے دبیز پردوں میں سے صبح اول کا چہرہ عمودی طور پر نمودار ہوا۔ یہ حالت کے بدلنے کا پیغام تھا اور نور سحر کے پھوٹنے کا نقطہ اولیں تھا۔ دوسرے مرحلے پر چہرہ افق فجر کی کرنوں سے اجلا ہونا شروع ہو گیا۔ یہ صبح صادق کا افتتاح تھا۔ پھر اس کے بعد تیسرے مرحلے پر ہر طرف سفیدی چھا گئی۔ "صبح کاذب" آغاز سحر کے اعتبار سے اولیت کے شرف سے بہرہ ور ہوئی اور "صبح صادق" نے شباب سحر کے لحاظ سے اوّلیت کا درجہ پایا، جو بالآخر فجر کے اجالے پر اختتام پذیر ہو گئی۔ پہلے دونوں مرحلوں کو فجر کہتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے موقع و محل کے اعتبار سے اول بھی ہیں۔ پہلی فجر اس لیے اول ہے کہ اس نے اپنے نور سے رات کی ظلمتوں کا سینہ چاک کیا اور سحر پھوٹ پڑی اور دوسری فجر اس لیے اول ہے کہ حقیقت میں اسی سے صبح کے اجالے کا آغاز ہوا اور دن کو ظہور نصیب ہوا۔

مراتب ظہور آفتاب اور حقیقت اوّلیت

بالآخر آفتاب عالمتاب کے طلوع کا وقت آن پہنچا۔ یہ ظہور بھی مرحلہ وار ہوتا

ہے۔ طلوع آفتاب کی تدریجی منزلوں میں سے پہلی منزل یہ ہے کہ افق پر سفیدی کے

ساتھ ساتھ سرخی پھیلنے لگتی ہے۔ مگر اس سرخی کے ایک ایک نقطے سے روشنی پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بالآخر ایک جگہ پھٹ جاتی ہے اور سورج کا سرخ و سفید تمتماتا اور دمکتا ہوا چہرہ نقاب الٹتا ہے۔ یہ اس کا ظہور اولیں ہوتا ہے۔ لیکن ابھی اس کی روشنی زمین پر نہیں پڑی ہوتی۔ تھوڑی دیر میں اس کی شعاعیں بلند و بالا میناروں اور عمارتوں پر پڑنے لگتی ہیں اور رفتہ رفتہ ساری زمین اس کی روشنی سے فیض یاب ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے انوار کے ظہور کا دوسرا مرحلہ ہے۔ مگر ابھی تک سورج کا جلوہ تمازت آشکار نہیں ہوا ہوتا۔ تیسرا مرحلہ سورج کے ظہور تمازت و حرارت کا ہوتا ہے۔ اب آہستہ آہستہ ان شعاعوں میں گرمی اور تپش پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مرحلہ اشراق کے وقت سے آغاز پذیر ہو کر چاشت سے گزرتا ہوا نصف النہار تک پہنچتے پہنچتے اپنے آخری نقطہ کمال کو چھو لیتا ہے۔

چنانچہ طلوع آفتاب کے ان تمام مراحل پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی اولیت کے تین درجے ہیں۔ اگر کوئی شخص سینہ شفق کے پھوٹنے اور اس میں سے چہرہ آفتاب کے نمودار ہونے کے لحاظ سے اولیت کو متعین کرنا چاہے تو سورج کا مشرق سے جزوی طور پر ظہور پذیر ہونا ہی اس کے طلوع کا پہلا مرحلہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص طلوع آفتاب سے مراد وہ روشنی اور نورانی کرنیں لے رہا ہو جو صفحہ ہستی کو منور اور چہرہ گیتی کو چمکا دیتی ہیں تو شرف اولیت اس مرحلے کو حاصل ہو گا جب پورا سورج افق کے پردوں سے باہر نکل کر بلند ہوتا ہے اور اس کی پہلی شعاع فلک بوس میناروں پر پڑتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص ظہور حرارت و تمازت کے اعتبار سے اولیت کو متعین کرنا چاہے تو یہ شرف لامحالہ وقت اشراق کو نصیب ہو گا۔ چنانچہ مختلف اعتبارات کی بناء پر اولیت طلوع کی نسبت تین مختلف اقوال تو معرض وجود میں آ گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کا مخالف یا متضاد نہیں۔ یہی حال اولیت تنزیل قرآن کی بابت مختلف اقوال کا ہے۔ جس طرح صبح کاذب سے سحر تو پھوٹی تھی لیکن دنیا کو اجالا صبح صادق نے دیا۔ اسی طرح سورج کے نکلنے سے افق کے پردے تو چاک ہوئے تھے لیکن

روشنی اور تمازت کا آغاز سورج کی پہلی کرن کے نکلنے کے بعد ہوا۔ بالکل پہلی سورہ اقرا کے نزول سے ایک طویل شب تاریک کے بعد پہلی صبح تو ظہور پذیر ہوئی جس سے وحی و الہام کی سحر پھوٹ گئی لیکن ظلمت کدہ عالم میں اجالا کرنے کے لیے ایک دوسری صبح کی بھی ضرورت تھی۔ جس کی آمد کا پیغام "سورہ مدثر" نے دیا اور اس کا باقاعدہ آغاز نزول فاتحہ سے ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اولیت تنزیل کے بارے میں جس نے جس اعتبار سے سوال کیا اس کو اسی حوالے سے جواب ملا۔ چنانچہ یہ روایات و اقوال ظاہرا مختلف تو تھے لیکن باہم مخالف نہ تھے۔

ایک قرآنی استدلال

مذکورہ بالا دونوں مثالوں میں اولیت تنزیل قرآن کا مسئلہ طلوع صبح کے مراتب کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مقام پر خود قرآنی استدلال اسی امر کی نشاندہی کرتا ہے۔ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ○ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ○ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○

(التکویر، ۸۱: ۱۷۔۱۹)

اور رات کی قسم جب اس کی تاریکی جانے لگے اور صبح کی قسم جب اس کی روشنی آنے لگے۔ بے شک یہ (قرآن) بڑی عزت و بزرگی والے رسول کا (پڑھا ہوا) کلام ہے۔

الفاظ قرآنی کی صوتی حکمت کے پیش نظر اگر آپ "عَسْعَسَ" کے لفظ پر غور فرمائیں تو اس میں واپس جانے میں آہستگی اور تدریج کا مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح رات کی آمد تدریجاً اور آہستگی کے ساتھ تھی کہ سب سے پہلے سورج غروب ہوا اور پھر اجالا ختم ہونے لگا۔ تاریکی کے سائے رفتہ رفتہ چھانے لگے اور بالآخر اندھیرے نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسی طرح رات کی واپسی بھی تدریجی ہوتی ہے، جس کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں۔ رات کی واپسی میں جو تدریج کار فرما ہے، صبح کی آمد کی تدریج بھی وہی ہے۔ رات جوں جوں ایک قدم پیچھے ہٹتی ہے، وہی قدم صبح آگے کو بڑھتی جاتی

ہے۔ لہذا عسعس کی تدریج تنفس کی تدریج ہی کی دلیل اور وجہ قرار پائی اس لیے "صبح" کی قسم اسکے سانس لینے کی کیفیت کے حوالے سے اٹھائی گئی۔ کیونکہ سانس لینے کے عمل میں بھی تدریج پائی جاتی ہے۔ اب رات کی تدریجی واپسی اور صبح کی مرحلہ وار آمد کا تذکرہ کر کے اعلان کیا گیا:-

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ — بے شک یہ (قرآن) بڑی عزت و بزرگی والے رسول کا (پڑھا ہوا) کلام ہے۔ (تکویر، ۸۱:۱۹)

اس آیت کا اپنے ماقبل سے معنوی تعلق یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو اولیت تنزیل قرآن کی حالت اور کیفیت سمجھائی گئی کہ اس عالم پر کفرو شرک اور ظلم و عصیان کی تاریک رات چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کسی سمت اجالے کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ ظلمتوں اور تاریکیوں کی اس طویل رات نے کروٹ لی۔ افق پر سحرہدایت پھوٹی، وحی و الہام کے سویرے کا پیغام آیا کہ اب شب ظلمت جانے والی ہے اور صبح ہدایت کی آمد قریب ہے۔ یہ پیغام در حقیقت وہ پہلی وحی تھی جو غار حراء میں سورہ اقرأ کی پہلی پانچ آیتوں کی صورت میں نازل ہوئی۔ اس وقت سورہ اقرأ پوری نازل نہیں ہوئی کیونکہ محض انفجار مقصود تھا تاکہ نئے دور کے آغاز کا پیغام دیا جاسکے۔ اس کے بعد "سورہ مدثر" کی پہلی چند آیات نازل کی گئیں۔ وہ بھی پوری سورت نازل نہ ہوئی۔ سحر وحی و ہدایت تو پہلے ہی پھوٹ چکی تھی لیکن اب ان آیات کے نزول سے چہرہ افق کو روشنی اور اجالے کا پیغام ملا۔ گویا رات کی روانگی کے موقع پر یہ دن کی آمد کا اعلان تھا۔ یہ وہ حقیقی نقطہ انفصال تھا جس نے نئے دن کی بنیاد رکھی لیکن تعلیمات الٰہیہ کا وہ سبق اولین جس نے افق عالم پر ہدایت کی روشنی بکھیر دی "سورہ فاتحہ" تھی۔ یہی وہ سورت تھی جو صبح کامل بن کر منصۂ حیات پر چمکی۔ جو روشنی غار حرا میں اقرأ کی صورت میں مختصر لمحے کے لئے فجر اول کی طرح پھوٹی تھی اور وادی کے واقعہ کے بعد يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ کی صورت میں فجر ثانی کی طرح چمکی تھی اب پہلی مرتبہ سورہ فاتحہ کے مکمل روپ میں کھلے انداز میں جلوہ فگن ہوگئی۔ رات کے سب اندھیرے کافور ہو گئے۔ صبح ہدایت چمک اٹھی۔ اور قرآنی انوار کے اجالے کا دن طلوع ہوگیا۔ اس لئے باری

تعالیٰ نے عالم دنیا میں قرآن کی مرحلہ وار آمد کا ذکر رات کے رفتہ رفتہ جانے اور صبح کے سانس لیتے ہوئے آنے کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ **اقرأ** اور **المدثر** کی اولیت ان کے اپنے اپنے اعتبار سے محض نزول وحی کے معنی میں تھی۔ لیکن **الفاتحہ** کی اوّلیت پوری سورت کے نزول کے اعتبار سے ہے کیونکہ یہی وہ سورت تھی جو بیک وقت مکمل طور سب سے پہلے نازل ہوئی اور انسانوں کے درس حیات کا پہلا مکمل سبق قرار پائی۔

مذکورہ بالا مثالوں سے اولیت کا مفہوم اور اس کی اضافی حیثیت کچھ واضح ہو چکی ہوگی کہ کس طرح اولیت کا قول ایک ہی معاملے میں مختلف چیزوں یا مرحلے پر صادر آتا ہے۔ اب ہم اس کی وضاحت اولیت خلق کے مراتب کی تمثیل سے کرتے ہیں۔

مراتب اوّلیت خلق کی تمثیل

اولیت تنزیل کی بحث کو مراتب اولیت خلق کی تمثیل سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کائنات میں کس چیز کو سب سے پہلے تخلیق کیا گیا۔ یہ سوال اپنی جگہ نہایت اہم اور دلچسپ تھا اور اس کا تعلق کائنات کی حقیقت کو سمجھنے سے بھی تھا چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سوال کیا۔

یارسول اللہ ﷺ بابی انت وامی اخبرنی عن اول شئی خلقہ اللہ تعالیٰ قبل الاشیاء قال یا جابر ان اللہ تعالیٰ خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ فجعل ذلک النور یدور بالقدرۃ حیث شاء اللہ تعالیٰ ولم فی ذلک الوقت لوح ولا قلم ولا جنۃ ولا نار ولا ملک ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا جن ولا انس

یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ مجھ کو خبر دیجئے کہ سب اشیاء سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کونسی چیز پیدا کی؟ آپ نے فرمایا اے جابر! اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے (نہ بایں معنی کہ نور الٰہی اس کا مادہ تھا بلکہ اپنے نور کے فیض سے) پیدا کیا پھر وہ نور قدرت الٰہیہ سے جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا سیر کرتا رہا اور اس

(مصنف عبدالرزاق' بحوالہ قسطلانی' جلد ۱: ص ۹)

وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا اور نہ بہشت تھی اور نہ دوزخ تھا اور نہ فرشتہ تھا اور نہ آسمان تھا اور نہ زمین تھی اور نہ سورج تھا اور نہ چاند تھا اور نہ جن تھا اور نہ انسان تھا۔

(ترجمہ: از مولانا اشرف علی تھانوی' نشر الطیب' ۱۴)

اوّلیت نور محمدی ﷺ

مولانا اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے نور محمدی کا اول الخلق ہونا باوّلیت حقیقیہ ثابت ہوا کیونکہ جن جن اشیاء کی نسبت روایات میں اولیت کا حکم آیا ہے ان اشیاء کا نور محمدی ﷺ سے متاخر ہونا اس حدیث میں منصوص ہے۔

(نشر الطیب' ۱۵)

حدیث مذکورہ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کائنات میں جس کی تخلیق سب سے پہلے ہوئی وہ نور محمدی ﷺ ہے۔ گویا نور محمدی ﷺ کو کائنات کے نظام تخلیق میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اگر ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب زمین و آسمان' عرش و کرسی' لوح و قلم اور ہوا و خلا الغرض ہر چیز سے پہلے نور محمدی ﷺ کی تخلیق ہوئی تو وہ نور کہاں مقیم تھا اس کا جواب تو حدیث میں پہلے ہی آگیا ہے کہ قدرت الٰہیہ کو جہاں منظور ہوا وہ نور سیر کرتا رہا لیکن اس کی وضاحت ایک اور حدیث سے ہو جاتی ہے جو امام حسین رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

ان النبی ﷺ قال کنت نوراً بین یدی ربی قبل خلق اٰدم باربعۃ عشر الف عام

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ میں تخلیق آدم سے چودہ ہزار برس پہلے اپنے پروردگار کے حضور میں ایک نور تھا۔

(احکام ابن القطان بحوالہ قسطلانی' ۱: ۱۰)

اس حدیث سے اس وقت نور محمدی ﷺ کا حضور الٰہی میں موجود رہنا ثابت ہو گیا۔ جہاں تک مدت کے تعین کا تعلق ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں۔

اس عدد میں کم کی نفی ہے زیادتی کی نہیں' پس اگر زیادتی کی روایت پر نظر پڑے تو شبہ نہ کیا جائے' رہ گئی تخصیص اس کے ذکر میں' سو ممکن ہے کہ کوئی خصوصیت مقامیہ اس کو مقتضی ہو۔ (نشر الطیب' ۱۷)

اس سے مراد یہ ہے کہ ممکن ہے چودہ ہزار برس کا ذکر سیاق گفتگو میں پہلے ہو رہا ہو جس کے حوالے سے حضور علیہ السلام نے اپنے نور کا ذکر فرمایا ہو۔ پھر یہ مدت بھی عالم امر کے اوقات کے لحاظ سے معلوم ہوتی ہے اور مزید یہ ہے۔ یہ تعین کم سے کم مدت پر دلالت کرتا ہے۔ فی الحقیقت ایسی حالت کتنا عرصہ رہی یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ اولیت خلق کا رتبہ بلا اختلاف نور محمدی ﷺ کو حاصل ہے۔ جس کی تصریح بیشمار محدثین اور آئمہ نے متعدد احادیث کے ذریعے کی۔

اولیت قلم کی روایت

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

قال رسول اللہ ﷺ ان اول ما خلق اللہ القلم فقال لہ اکتب قال ما اکتب قال اکتب القدر فکتب ما کان و ما ھو کائن الی الابد

(ترمذی' ۲:۳۸)

(رسول اللہ ﷺ وسلم نے فرمایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ پھر اسے فرمایا کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا' کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا قدر تحریر کر پس اس نے جو کچھ پہلے ہو چکا تھا اور جو کچھ ابد تک ہونے والا تھا سب لکھ دیا۔)

حدیث مذکورہ سے قلم کا اول الخلق ہونا ثابت ہے اور اس کا ظاہراً پہلی حدیث سے اختلاف نظر آتا ہے ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ اب ان دو حدیثوں کی روشنی میں کس چیز کو اول مانا جائے نور محمدی ﷺ کو یا قلم کو یہاں بھی اختلاف ظاہری کی

[illegible]
میں اختلاف رفع ہو جاتا ہے۔ حدیث ترمذی پر غور کریں تو ابتداء میں قلم کی اولیت خلق بیان ہوئی ہے لیکن آخر حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

فکتب ما کان و ما ھو کائن الی الابد (ترمذی، ۲: ۳۸)	جو کچھ قلم سے پہلے ہو چکا تھا اور کچھ ابد تک ہونے والا تھا اس نے سب لکھ دیا۔

اگر قلم کو ہی حقیقت میں سب سے پہلے پیدا کیا گیا تو سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا تھا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا جس کے احوال کو قلم نے تحریر کیا اور جس کو حدیث میں **ما کان** کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ اسی حدیث کی عبارت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قلم سے پہلے بھی فی الحقیقت باری تعالیٰ نے کچھ تخلیق کر رکھا تھا۔ جو قلم سے بھی اول تھا۔ اس تعارض کو امام ابہری رحمتہ اللہ علیہ نے رفع کیا ہے جسے ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ یوں بیان کرتے ہیں۔

فالاولیۃ اضافیۃ الاول الحقیقی ھو النور المحمدی ﷺ (مرقاۃ المفاتیح، ۱: ۱۳۹)	پس قلم کی اولیت اضافی ہے۔ حقیقی اولیت تو نور محمدی ﷺ کو ہی حاصل ہے۔

نور محمدی ﷺ کی حقیقی اوّلیت

آئمہ و محدثین اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ قلم کی اولیت نور محمدی ﷺ کے بعد باقی تمام اشیاء پر ہے۔ نور محمدی ﷺ کی اولیت سے اس کا کوئی تعارض نہیں کیونکہ نور محمدی ﷺ کی پوری کائنات پر حقیقی اولیت ہر شک و شبہ اور اختلاف سے بالا تر ہے۔ لہٰذا اس کے علاوہ جس چیز کی نسبت اولیت کا کوئی قول ملے گا اس سے مراد ہمیشہ خلق نور محمدی ﷺ کے بعد دیگر اشیاء پر اولیت ہو گی۔ یہی وضاحت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت سے ہوتی ہے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔ (حدیث کا بقیہ حصہ ملاحظہ فرمائیں)

فلما اراداللہ ان یخلق الخلق قسم ذالک النور اربعۃ اجزاء فخلق من الجزء الاول القلم' من الثانی اللوح و من الثالث العرش ثم قسم الجزء الرابع اربعۃ اجزاء فخلق من الجزء الاول حملۃ العرش و من الثانی الکرسی و من الثالث باقی الملائکۃ ثم قسم الجزء الرابع اربعۃ اجزاء فخلق من الاول السمٰوت و من الثانی الارضین و من الثالث الجنۃ والنار (مصنف عبدالرزاقؒ بحوالہ قسطلانی جلد ۱:۹)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور یعنی نور محمدی ﷺ کے چار حصے کیے- ایک حصے سے قلم پیدا کیا- دوسرے سے لوح اور تیسرے سے عرش' پھر چوتھے کے چار حصے کیے- ایک سے حاملان عرش کو پیدا کیا- دوسرے سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے' پھر چوتھے کے چار حصے کیے- ایک سے آسمان بنائے' دوسرے سے زمین' اور تیسرے سے جنت و دوزخ --- (طویل حدیث ہے)

اس حدیث کو "سیرت حلبیہ' ۱: ۳۰" اور "زرقانی' ۱: ۴۶" پر بھی نقل کیا گیا ہے- اس کے علاوہ امام بیہقیؒ نے بھی "دلائل النبوۃ" میں اس حدیث کو تقریباً اسی طرح روایت فرمایا ہے- امام ابن حجر مکیؒ' امام بکریؒ اور علامہ فاسیؒ بھی اپنی تصانیف میں اس حدیث کو روایت کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں- امام ابوالحسن اشعریؒ جو عقائد میں امام علی الاطلاق ہیں اسی حدیث رسول ﷺ کی روشنی میں فرماتے ہیں:-

انہ تعالیٰ نور لیس کالانوار والروح النبویۃ القدسیۃ لمعۃ من نورہ والملائکۃ شرر تلک الانوار و قال ﷺ اول ما خلق اللہ نوری و من نوری خلق کل شئی (مطالع المسرات از علامہ فاسیؒ)

اللہ تعالیٰ ایسا نور ہے کہ جو کسی نور کی مثل نہیں اور حضور ﷺ کی روح مقدسہ اسی نور کی چمک ہے اور فرشتے انہی انوار سے جھڑے ہوئے پھول ہیں اور رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا اور باقی ہر چیز میرے نور سے پیدا کی-

امام عبدالغنی نابلسیؒ فرماتے ہیں:-

قد خلق کل شی من نورہ ﷺ کما ورد بہ الحدیث الصحیح

(الحدیقۃ الندیہ، مبحث ۲، نوع ۶۰)

بیشک ہر چیز نور محمدی ﷺ سے پیدا کی گئی جیساکہ اس پر حدیث صحیح وارد ہوئی ہے۔

ان کے علاوہ ملا علی قاریؒ "مرقاۃ المفاتیح" میں اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ "مدارج النبوۃ" میں "اول ما خلق اللہ نوری" (سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا گیا) کی حدیث نقل کر کے اس پر کامل اعتماد ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ شیخؒ اس کو "مدارج النبوۃ ۲:۲" پر حدیث صحیح قرار دیتے ہیں۔ مزید برآں جلیل القدر محدث اور مفسر علامہ آلوسیؒ بھی نور محمدی ﷺ کی اولیت خلق کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ولذا کان نورہ ﷺ اول المخلوقات ففی الخبر اول ما خلق اللہ تعالی نور نبیک یا جابر

(تفسیر روح المعانی)

کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا نور مبارک ساری مخلوقات سے پہلے تھا۔ حدیث میں ہے کہ اے جابر! اللہ تعالیٰ نے سب پہلے تیرے نبی کا نور پیدا فرمایا۔

علاوہ ازیں اسی حدیث کو متاخرین میں بیشمار آئمہ و محدثین اور علماء کاملین نے قبول کر کے اس کی تائید و تشریح میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جس کی تفصیل حیطہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اپنی کتاب "نشر الطیب" کی پہلی فصل (نور محمدی ﷺ کے بیان میں) کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔ اور پھر اس کی تائید میں متعدد روایات لائے ہیں۔ اس حدیث کی صحت و قبولیت کے لیے در حقیقت یہی امر کافی ہے کہ اس کی تخریج امام عبدالرزاقؒ نے اپنی سند کے ساتھ کی جو امام بخاریؒ و مسلمؒ کے استاذ الاستاذ اور امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر جلیل القدر آئمہ حدیث کے استاد ہیں اور جن کے بارے میں امام احمد بن صالح المصریؒ فرماتے ہیں:۔

قلت لاحمد بن حنبل رأیت احدًا احسن حدیث من عبدالرزاق قال لا

(تہذیب التہذیب، ۶:۳۱۱)

میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا۔ کیا آپ نے کوئی شخص حدیث میں امام عبدالرزاقؒ سے بہتر دیکھا۔ انھوں نے فرمایا نہیں۔

ان احادیث و روایات سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ خلق میں حقیقی اولیت تو نور محمدی ﷺ کو ہی حاصل ہے اور خود قلم اور دیگر تمام اشیاء کو نور محمدی ﷺ سے پیدا کیا گیا۔ اس لیے قلم سمیت باقی سب مخلوقات نور محمدی ﷺ سے متاخر ہیں اور قلم کی اولیت کا معنی یہ ہے کہ جب نور محمدی ﷺ کے فیضان سے دیگر مخلوقات کو پیدا کیا جانے لگا تو سب سے پہلے قدرت نے قلم کو تخلیق فرمایا۔ اس طرح اولیت کے دونوں اقوال درست ہو گئے اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔ شارح بخاری امام قسطلانیؒ یہی فرماتے ہیں:۔

ان اولیۃ القلم بالنسبۃ الی ماعدا النور النبوی المحمدی ﷺ

قلم کی اولیت نور محمدی ﷺ کے علاوہ باقی اشیاء کی نسبت سے ہے

(المواہب اللدنیہ ۱:۱۰)

اب نور محمدی ﷺ کے بعد بھی اولیت خلق کے مسئلے پر روایات مختلف ہیں۔ امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں:۔

وقد اختلف هل القلم اول المخلوقات بعد النور المحمدی فقال الحافظ ابو یعلی الهمدانی الاصح ان العرش قبل القلم

(المواہب اللدنیہ ۱:۹)

اس مسئلے پر اختلاف ہوا ہے کہ کیا نور محمدی ﷺ کے بعد سب سے پہلی مخلوق قلم ہے؟ حافظ ابو یعلی ہمدانیؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ قلم سے پہلے عرش کو پیدا کیا گیا۔

حقیقی اور اضافی اولیت میں فرق

مختلف روایات جو اولیت خلق کے باب میں ملتی ہیں ان سب کی تطبیق محدثین اور آئمہ کرام نے یوں کی ہے کہ نور محمدی ﷺ کی اولیت تو بلا اختلاف حقیقی اور مطلق ہے اور باقی سب اقوال "اضافی اولیت" سے متعلق ہیں۔ یعنی "قلم"، "عرش" یا "عقل" وغیرہ کی اولیت مختلف اجناس کے اعتبارات سے ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز اپنی جنس کے اعتبار سے اول ہے اور دوسری اپنی جنس کے اعتبار سے۔ جب

اعتبار بدل گیا تو ہر ایک کی اولیت اپنے اپنے لحاظ سے قائم رہی خواہ کوئی حقیقتاً کسی پر مقدم ہو یا مؤخر۔ چنانچہ اولیت خلق کی تمام روایات باہم مطابق ہو گئیں اور کسی کا کسی سے کوئی تضاد یا تعارض نہ رہا۔ نور محمدی ﷺ کی اولیت مطلق اور حقیقی ہوئی اور باقی اشیاء مذکورہ کی اولیت اضافی اور اعتباری اسی تمثیل سے اولیت تنزیل کے مسئلے کو سمجھا جا سکتا ہے کہ "اقرأ" ، "مدثر" اور "فاتحہ" میں سے ہر ایک کے بارے میں قول الگ الگ اعتبار سے ہے۔ کسی ایک کا دوسرے سے تعارض نہیں۔

۱:- اقرأ کا قول مطلقاً نزول وحی میں حقیقی اولیت کا حامل ہے۔

۲:- مدثر کا قول فرضیت انذار اور حکم تبلیغ میں اضافی اولیت کا حامل ہے۔

۳:- اور فاتحہ کا قول نزول سورت میں خصوصی اولیت کا حامل ہے۔

گویا **اقرأ** کی پانچ آیات سے صرف وحی الٰہی کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا۔ **المدثر** کی ابتدائی آیات سے حضور ﷺ کو تبلیغ احکام کا فریضہ سونپا گیا اور **الفاتحہ** کی پوری سورت بیک وقت نازل فرما کر بنی نوع انسان کو ابدی سعادت کا پہلا باقاعدہ درس دیا گیا۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے اعتبار سے اولیت تنزیل کا ہی شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے کسی کا کسی پر تقدم و تاخر اس کی شان اولیت کو متاثر نہیں کرتا۔

مراتب ظہور نبوت کی تمثیل

اب ہم اولیت تنزیل کی بحث کو مراتب ظہور نبوت کی تمثیل سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ سلسلہ نبوت کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ اس طرح گروہ انبیاء میں شرف اولیت آپ کے حصے میں آیا۔

اولیت نبوت آدم علیہ السلام

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے:-

قال قلت یا رسول ﷺ ای	حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا

ا[illegible] نبیا کان [illegible] قال [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [illegible] سب سے پہلے نبی

رسول اللہ و نبی کان قال نعم نبی مکلم

(مسند احمد ۵: ۱۷۹)

کون تھے؟ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا- آدم علیہ السلام میں نے پوچھا- آدم نبی تھے، فرمایا- ہاں وہ نبی تھے- خدا نے ان سے کلام کیا-

اس کے علاوہ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:-

انا سید ولد ادم یوم القیمۃ و لا فخر و بیدی لواء الحمد و لا فخر و ما من نبی یومئذ ادم فمن سواہ الا تحت لوائی و انا اول من تنشق عنہ الارض و لا فخر

(جامع الترمذی، ۲: ۲۰۲)

روز قیامت میں بنی آدم کا سردار ہوں گا اور میں یہ فخر سے نہیں کہتا اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہو گا- فخر سے نہیں کہتا اور قیامت کے روز کوئی نبی خواہ آدم ہوں یا ان کے علاوہ ایسا نہ ہو گا جو میرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو اور قیامت کے روز سب سے پہلے میں قبر سے اٹھوں گا اور اس پر مجھے فخر نہیں-

اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ سب سے پہلے نبی ہیں- جس سے مراد یہ ہے کہ خواہ سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام ہوں یا ان کے بعد آنے والے دیگر انبیاء و رسل علیہم السلام سب میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے- ان احادیث سے دنیائے انسانیت میں ظہور نبوت کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ثابت ہوتا ہے کہ وہی اول الانبیاء تھے-

اولیت نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مذکورہ بالا تصور جو اولیت نبوت آدم علیہ السلام سے متعلق ہے ذہن میں رکھتے ہوئے نبی [illegible] کے دوسرے پہلو کی طرف توجہ فرمائیں کہ احادیث صحیحہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بھی پہلے نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ثبوت پر شاہد عادل ہیں-

قال قالوا یا رسول اللہ ﷺ متی وجبت لک النبوۃ قال و اٰدم بین الروح و الجسد

(جامع ترمذی ۲:۲۰۱)

انہوں نے کہا کہ صحابہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا- یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو نبوت کے شرف سے کب بہرہ ور کیا گیا تھا- حضور علیہ السلام نے فرمایا- اس وقت سے جب کہ آدم علیہ السلام روح اور بدن کے درمیان تھے یعنی ان کی تخلیق بھی عمل میں نہیں آئی تھی-

اس حدیث سے نبوت محمدی ﷺ کا تخلیق آدم علیہ السلام پر مقدم ہونا ثابت ہو گیا- سابقہ عنوان نے جو مراتب اولیت خلق کے بیان پر مشتمل تھا صرف تخلیق کی حد تک اولیت کے مسئلے پر روشنی ڈالی تھی- جس سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوئی کہ کائنات میں خلقت کے اعتبار سے نور محمدی ﷺ کو حقیقی اولیت کا شرف حاصل ہے اور باقی اشیاء اپنی اپنی اجناس کے لحاظ سے اضافی اور اعتباری اولیت رکھتی ہیں- لیکن اس حدیث نے مسئلہ تخلیق پر نہیں بلکہ ثبوت نبوت کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے کہ شرف نبوت میں اولیت کس کو حاصل ہے-

حدیث مذکورہ کا معنی یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے نبوت محمدی ﷺ کا ثبوت محض علم الٰہی میں تھا اور عالم خارج میں نہ تھا- کیونکہ اس معنی سے تو آنحضرت ﷺ کی کوئی امتیازی فضیلت باقی نہیں رہتی- اس لیے کہ علم الٰہی میں تو تمام انبیاء کی نبوتیں تھیں- اس میں حضور علیہ السلام کا کونسا امتیاز تھا- حالانکہ یہاں تو حضور ﷺ کی نبوت کی امتیازی خصوصیت بیان ہو رہی ہے- مزید یہ کہ "علم الٰہی میں آنحضرت ﷺ کا نبی ہونا کب سے تھا-" یہ سوال تو سائلین کے ذہن میں بھی نہ تھا- کیونکہ اس امر کے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی- کائنات کی ہر چیز تخلیق کائنات سے پہلے علم الٰہی میں تھی- صحابہ کرام کا سوال تو یہ ہے کہ "متی وجبت لک النبوۃ" (آپ کے لیے نبوت کس وقت ثابت اور واجب ہوئی) ثبوت وجود کو مستلزم ہے- جس

کا مقصد یہ نہ تھا کہ تخلیق محمدی ﷺ تو ساری کائنات سے پہلے ہو چکی تھی۔ لیکن شرف نبوت سے حضور ﷺ کو کس وقت ہمکنار کیا گیا۔ جس کا جواب حضور علیہ السلام یہ دے رہے ہیں۔ ''کہ میں اس وقت سے نبی ہوں جب آدم علیہ السلام کی تخلیق بھی عمل میں نہ آئی تھی۔''

ہمارے نقطہ نظر کی مزید وضاحت علامہ انور شاہ کشمیری کی بیان کردہ اس حدیث کی شرح سے ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ای کان النبی ﷺ نبیاً و جرت علیہ احکام النبوۃ من ذالک الحین بخلاف الانبیاء السابقین فان الاحکام جرت علیہم بعد البعثۃ

(العرف الشذی علی جامع الترمذی' ابواب المناقب)

یعنی نبی ﷺ اس وقت بھی نبی تھے اور آپ پر احکام نبوت جاری ہو چکے تھے بخلاف انبیاء سابقین کے کہ ان پر احکام نبوت کا اجراء بعثت کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام کو نبوت مع احکام تخلیق آدم سے بھی پہلے واقع ہوئی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسی حدیث کے تحت فرماتے ہیں:۔

سألتہ سوالاً روحانیاً عن معنی قولہ کنت نبیاً و ادم منجدل بین الماء والطین' ففاض علی روحی من روحہ الکریمۃ الصورۃ المثالیۃ التی کانت قبل ان یوجد فی عالم الاجسام وان فیضانہا فی الحضرۃ المثالیۃ کان عند کون ادم منجدلا بین الماء والطین وان لہ ﷺ ظہورًا تامًا فی تلک الحضرۃ و ھو

میں نے حضور ﷺ سے ان کے ارشاد کہ ''میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے خمیر میں تھے'' کے بارے میں روحانی طور پر سوال کیا تو حضور کی روح طیبہ میری روح پر اس صورت مثالی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی جس میں وہ عالم اجسام میں آنے سے پہلے موجود تھی اور اس کا فیضان عالم مثال میں تخلیق آدم سے بھی پہلے جاری تھا۔

المعبر عنه بالنبوة في هذا الحديث (تفہیمات الٰہیہ)

حضور علیہ السلام کو اس عالم میں بھی ظہور تام حاصل تھا۔ جس کو اس حدیث میں نبوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ کشمیری نے اسی سلسلے میں حضرت جامیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

انه ﷺ كان نبيا قبل نشأة العنصرية

حضور علیہ السلام وجود عنصری پانے سے بھی پہلے نبی تھے۔

(العرف الشذی:۴۸۵، ابواب المناقب)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضور کا یہ ارشاد صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس سوال کے جواب میں تھا (متی وجبت) کہ آپ کو نبوت کب حاصل ہوئی۔ لہٰذا حضور کے جواب کا معنی بھی یہی ہو گا کہ مجھے نبوت اس وقت سے حاصل ہے جب آدم ابھی اس حالت میں تھے۔" (مرقاۃ المفاتیح از ملا علی قاریؒ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ حدیث مذکورہ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ "اس سے نبوت میں حضور علیہ السلام کا حضرت آدم پر تقدم اور سبقت ثابت ہوتی ہے۔" (لمعات التنقیح)

امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں:۔ "یہ حدیث تخلیق آدم سے قبل خارج میں نبوت محمدی ﷺ کے ثبوت اور ظہور کی دلیل ہے۔" (المواہب اللدنیہ)

اس امر کی مزید وضاحت خود ایک حدیث صحیح سے بھی ہو جاتی ہے۔ جس میں آپ نے اپنے "وصف ختم نبوت" کے بارے میں بیان فرمایا کہ وہ تخلیق آدم سے پہلے عنداللہ لکھا جا چکا تھا۔ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

انه قال انی عندالله مکتوب خاتم النبین و ان اٰدم لمنجدل فی طینته و ساخبرکم باول امری دعوة

حضور ﷺ نے فرمایا۔ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے خاتم النبیین لکھا جا چکا تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی اپنی

ابراهيم [illegible] و رؤيا امي
التي رأت حين وضعتني قد خرج لها
نور اضاء لها منه قصور الشام

(مسند احمد، حاکم، ابن عساکر، صحیح ابن حبان اور شرح السنہ وغیرہ) (بیہقی، ۱: ۸۴)

[illegible] تمہیں
بتاؤں کی میری نبوت کے بارے میں پہلی
خبر ابراھیم کی دعا تھی اور عیسیٰ کی بشارت
تھی اور اس کے علاوہ میری والدہ کا وہ
دیکھنا تھا جو انہوں نے (میری ولادت سے
پہلے) دیکھا تھا اور انہوں نے میری
ولادت کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک
نور نکلا جس کے سبب شام کے محلات
روشن ہو گئے) امام احمد بن حنبل ؒ نے یہ
حدیث "ساخبرکم" تک روایت کی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ مطلق شرف نبوت اور وصف ختم نبوت میں فرق ہے۔ وصف ختم نبوت کے ثبوت کے لیے تمام انبیاء و مرسلین کے بعد مبعوث ہونا شرط تھا۔ اس لیے اس وصف کے ذکر میں۔ **انی عنداللہ مکتوب خاتم النبین** " (کہ میں اللہ کے ہاں خاتم النبین لکھا جا چکا تھا) کے الفاظ بیان فرمائے۔ لیکن مطلقاً شرف نبوت کے لیے بعدیت اور آخریت (سب کے بعد میں اور آخر میں آنا) کی شرط نہ تھی۔ اس لیے اس شرف کا فی الواقع ثابت ہونا بیان فرمایا گیا۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا تو پہلی حدیث میں بھی صحابہ کے سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا تھا۔ "کہ میں خدا کے ہاں نبی لکھا جا چکا تھا۔" لیکن ایسا نہیں ہوا۔ "ثبوت نبوت" کے لیے فرمایا کہ "میرے لیے نبوت واجب اور ثابت ہو چکی تھی اور "ختم نبوت" کے لیے فرمایا کہ "میں خاتم النبین لکھا جا چکا تھا۔" ان دونوں ارشادات میں انداز بیان اور اسلوب کا فرق اس حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر رہا ہے کہ نبوت محمدی ﷺ کو فی الحقیقت اولیت حاصل ہے اور محدثین کرام ؒ کی تصریحات بھی اسی مفہوم کی مؤید ہیں۔

مذکورہ بالا مفہوم حضرت میسرہ، ابن ابی الجدعا اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی اس حدیث کی صورت میں مروی ہے جسے وہ ان الفاظ سے روایت کرتے ہیں:-

قلت یا رسول اللہ ﷺ متی کنت نبیا
قال ﷺ کنت نبیا و ادم بین
الروح و الجسد
(احمد بن حنبل، حاکم، بخاری، ابو نعیم،
طبرانی، ابن سعد)

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کب سے نبی ہیں؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا: میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم روح اور جسم کے مرحلے میں تھے۔

حدیث کے ان الفاظ نے پوری بحث کو مکمل کر دیا۔ ایک اور حدیث صحیح اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ اولیت نبوت محمدی ﷺ کو بیان کرتی ہے جسے امام احمد بن حنبلؒ مسند میں، امام بخاریؒ تاریخ میں، امام حاکمؒ صحیح مستدرک میں، امام ابو نعیمؒ دلائل میں، قاضی عیاضؒ الشفاء میں اور متعدد آئمہ اپنی کتب جلیلہ میں تخریج کرتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

کنت اول النبیین فی الخلق و
اخرھم فی البعث (الخازن، ۳: ۴۸۴)
(روح المعانی، ۱۱: ۱۵۴)

میں خلقت کے اعتبار سے تمام انبیاء سے پہلا نبی ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخری نبی ہوں۔

یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بیان کیا ہے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جیسے اسماء الرجال کے امام بھی اس کو قوی اور صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ امام شعبیؒ روایت کرتے ہیں:۔

قال رجل یا رسول ﷺ متی
استنبئت قال و ادم بین الروح
والجسد حین اخذ منی المیثاق
(رواہ ابن السعد من روایۃ الجابر
الجعفی بحوالہ قسطلانی)

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو کب نبی بنایا گیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ آدم علیہ السلام اس وقت روح اور جسم کے درمیان تھے۔ جب کہ مجھ سے نبوت کا میثاق لیا گیا۔

اس حدیث کے بعد تامل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ حدیث کی شرح خود حدیث نے کر دی ہے۔ اس میں سوال کے الفاظ بھی بڑے واضح ہیں کہ ”آپ

ﷺ کو منصب نبوت پر کب فائز کیا گیا' اور جواب بھی بڑا واضح ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ میثاق نبوت اس میثاق انبیاء سے بالکل مختلف تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ

(آل عمران' ۳:۸۱)

اور (اے محبوب! وہ وقت یاد کریں) جب اللہ نے انبیاء سے پختہ عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کردوں پھر تمہارے پاس وہ (سب پر عظمت والا) رسول تشریف لائے جو ان کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہو جو تمہارے ساتھ ہوں گی تو ضرور بالضرور ان پر ایمان لاؤ گے اور ضرور بالضرور ان کی مدد کرو گے۔

یہ میثاق تو تمام انبیاء کی ارواح سے خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں تھا۔ ان سے رسول اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کا وعدہ لیا جا رہا تھا۔ کیونکہ اسی کے باعث انہیں شرف نبوت سے بہرہ ور کیا جانا تھا۔ لہٰذا میثاق محمدی ﷺ یقیناً اس سے مختلف تھا۔ یہ میثاق وہ تھا جو حضور ﷺ کو منصب نبوت پر فائز کرتے ہوئے آپ کی روح طیبہ سے لیا گیا۔ جیسے کسی سربراہ کو اپنے منصب و عہدہ پر فائز کرتے ہوئے اس سے عہد لیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ عہد و میثاق عالم خارج میں فی الواقع اور بالفعل حضور علیہ السلام کو منصب نبوت پر سرفراز کرنے کے موقع پر لیا گیا۔ جس سے بلاشک و شبہ آپ کی نبوت کی اولیت اور تقدم ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد دیگر انبیاء کرام کی ارواح کو روح محمدی ﷺ اور نبوت محمدی ﷺ کی معرفت عطا کی گئی اور ان سے نبوت محمدی ﷺ پر ایمان لانے کا میثاق لیا گیا۔ جب وہ عالم ارواح میں نبوت محمدی ﷺ پر ایمان لے آئے تو تب خود شرف نبوت سے بہریاب ہوئے۔ امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں:۔

ان الله تعالى لما خلق نور نبينا محمد ﷺ امره ان ينظر الى انوار الانبياء عليهم السلام فغشيهم من نوره ما انطقهم الله به فقالوا يا ربنا من غشينا نوره فقال الله تعالى هذا نور محمد بن عبدالله ان امنتم به جعلتكم انبياء قالوا امنا به و بنبوته فقال الله تعالى اشهد عليكم قالوا نعم فذالک قوله تعالى و اذ اخذ الله ميثاق النبيين ----- وانا معكم من الشاهدين

(المواھب اللدنیہ' ۱:۸)

جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی محمد ﷺ کا نور تخلیق فرمایا تو اسے حکم دیا کہ انوار انبیاء علیہم السلام کی طرف متوجہ ہو پس حضور ﷺ کے (عظیم و کامل) نور نے انبیاء کرام کے انوار کو ڈھانپ لیا جس کے سبب خدا تعالیٰ نے (ارواح یا انوار انبیاء کو) بلوایا انھوں نے عرض کیا۔ اے رب ہمیں کس کے نور نے ڈھانپ لیا ہے پس اللہ نے فرمایا یہ محمد بن عبداللہ کا نور ہے۔ اگر تم اس پر ایمان لاؤ گے تو تب تمہیں نبی بناؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔ ہم اس پر اور اس کی نبوت پر ایمان لے آئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ میں خود تمہارے نبوت محمدی ﷺ پر ایمان لانے پر گواہ ہو جاؤں؟ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ لہٰذا اس امر کی طرف قرآن حکیم کے اس ارشاد میں اشارہ ہے "اور جب اللہ نے انبیاء سے یہ وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت عطا کروں پھر تمہاری طرف یہی آخرالزمان رسول آئے جو تمہاری تصدیق کرنے والا ہے تو تمہیں اس پر (پھر) ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنا ہو

ی ---- اور اب میں خود تمہارے ساتھ تمہارے اس اقرار و ایمان پر گواہ ہوں"۔

ان احادیث و روایات سے یہ حقیقت ہر شک و شبہ سے بالا تر ہو گئی ہے کہ نبوت محمدی ﷺ ہی شرف اولیت سے بہرہ ور ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبوت محمدی ﷺ اور نبوت آدم علیہ السلام دونوں کے بارے میں اولیت کے اقوال ہیں۔ ان کے درمیان تطبیق کیسے ہو گی۔ دراصل تطبیق کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ مذکورہ بالا تفصیلی بحث سے ظاہری اختلاف کلیتہً مرتفع ہو گیا ہے۔ وہ یوں کہ نبوت محمدی ﷺ کی اولیت مرتبہ ظہور روحانیت میں ہے اور نبوت آدم علیہ السلام کی اولیت مرتبہ ظہور بشریت میں ہے۔ یعنی عالم روحانیت میں حضور علیہ السلام کی نبوت اپنے ثبوت اور ظہور کے لحاظ سے اول ہے اور عالم بشریت میں حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت اپنے ثبوت اور ظہور کے لحاظ سے اول ہے۔

اسی لیے علماء و عرفاء روحانی اعتبار سے آنحضرت ﷺ کو اور جسمانی اعتبار سے آدم علیہ السلام کو اول الآباء بیان کرتے ہیں۔ یہ قول امام نبہانیؒ نے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔

"ان اصل ارواحنا روح محمد ﷺ فهو اول الآباء روحاً و آدم اول الآباء جسماً

(جواہر البحار ۱: ۱۳۱)

ہماری ارواح کی اصل روح محمدی ﷺ ہے لہٰذا حضور علیہ الصلوۃ والسلام روحانی اعتبار سے جبکہ آدم علیہ السلام جسمانی اعتبار سے ہمارے پہلے باپ ہیں۔

مزید برآں دونوں اقوال کا مفہوم یوں واضح کیا گیا ہے:۔

روحه ﷺ هی ام الارواح و

حضور ﷺ کی روح مبارک تمام

حقیقۃ اصل الحقائق و ھو ابو ادم من حیث الروح و أدم ابوہ من حیث الجسم و ھو اول النبین فی البطون و خاتمھم فی الظھور و ھو سلطانھم الاعظم

(جواہر البحار '۱: ۳)

ارواح کی اصل ہے اور آپ کی حقیقت تمام حقائق کی بنیاد ہے اور حضور علیہ السلام روح کے اعتبار سے حضرت آدم علیہ السلام کے باپ ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام جسم کے اعتبار سے حضور علیہ السلام کے۔ اور حضور علیہ السلام باطن میں تمام انبیاء سے اول ہیں اور ظاہر میں تمام سے آخر اور آپ ان سب انبیاء کے سلطان اعظم ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ اعتبار کے بدلنے سے حکم بھی بدل گیا۔ اگر اولیت و تقدم نبوت کو اپنے حقیقی معنی میں مطلقاً یا باعتبار روحانیت دیکھیں تو یہ شرف بلا اختلاف نبوت محمدی ﷺ کو حاصل ہے اور اگر باعتبار بشریت دیکھیں تو یہ شرف حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہے۔ لہٰذا دونوں اقوال میں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔ یہی حال اولیت تنزیل کے مسئلے کا ہے۔ اگر اسے فترت و انبعاث وحی کے اعتبار سے دیکھیں تو شرف اوّلیت اقرأ کو حاصل ہے۔ اگر سپردگی فریضہ تبلیغ کے اعتبار سے دیکھیں تو شرف اولیت المدثر کی آیات کو حاصل ہے، اور اگر باقاعدہ نزول سورت کے اعتبار سے دیکھیں تو شرف اولیت سورہ فاتحہ کو حاصل ہے۔

آغاز وحی اور نزول فاتحہ (انفجار سے انفلاق تک)

اب ہم مذکورہ بالا تمثیلات سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں آغاز وحی سے نزول فاتحہ تک کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ امر دلائل کے ذریعے واضح ہو چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات نہ صرف بعثت بلکہ ولادت و ظہور بشریت سے بھی پہلے شرف نبوت سے بہرہ ور تھی۔ حقیقت یہ ہے آپ کو اس مرتبہ و مقام عالی پر تخلیق آدم، جہاں سے سلسلہ آدمیت کا آغاز ہوا' سے بھی بہت پہلے فائز کر دیا گیا تھا اور

آپ کے فیضانِ نبوت سے اس وقت بھی ارواحِ انبیاء و صالحین مستفید و مستنیر ہوتی تھیں۔ تخلیق آدم کے بعد آپ کا نور اقدس نسلاً بعد نسلٍ اور قرناً بعد قرن جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے پاک اصلاب و ارحام میں سے منتقل ہوتا ہوا اس دور تک آن پہنچا۔ جس میں آپ کی بشریت مطہرہ کے ظہور کا وقت مقرر تھا۔ آپ کی ولادت ہوئی تو آپ ﷺ شروع سے ہی اپنے مقام نبوت سے آشنا تھے لیکن بعثت یعنی اعلان نبوت کے لیے ایک خاص مدت اور وقت مقرر کر دیا گیا تھا اور ذات حق سے بصورت وحی مخاطبہ و کلام بھی اسی بعثت کے موقع تک مؤخر کیا گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کی قبل از بعثت زندگی بھی اسی طرح پاکیزہ' مثالی اور لائق تقلید تھی جس طرح کہ بعد از بعثت۔ جوں جوں عمر مبارک مقررہ حد کے قریب پہنچتی گئی اور وقت بعثت نزدیک آتا گیا' حضور علیہ السلام کی بے تابی و بے قراری بڑھتی گئی۔ اضطراب والتہاب میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ کیفیت بالکل اسی طرح کی تھی جیسے ہجر و فراق کے طویل عرصے کے بعد کسی کو محبوب کی ملاقات ہونے والی ہو۔ جوں جوں وصال کی گھڑیاں قریب آتی جاتی ہیں بے چینی سخت ہیجان انگیز کیفیت میں بدلتی چلی جاتی ہے۔ صبروسکون کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا جاتا ہے۔ زمانہ فراق کی ساری بے قراریاں اور اداسیاں سمٹ کر شعلے کی طرح بھڑکنے لگتی ہیں۔ عشق و محبت کے جذبات بیتابانہ جوش مارنے لگتے ہیں اور جی یوں چاہتا ہے کہ آن واحد میں سب فرقتیں اور فاصلے دور ہو جائیں اور جلوہ حسن اتنا قریب ہو کہ اس میں گم ہو جانے کی آرزو پوری ہو سکے۔ احادیث و سیر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ وحی قریب آتا گیا اور حضور علیہ السلام کو خلوت و تنہائی عزیز تر ہوتی گئی۔ آپ کاروبار حیات کو چھوڑ کر دور ویرانے میں تشریف لے جاتے اور کئی کئی دن تک غار حرا میں معتکف رہتے۔ علامہ اقبالؒ اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

مصطفٰےؐ اندر حراء خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید

[illegible] ﷺ کے قلب [illegible] مراقبہ میں [illegible] ہوتے گئے آپ محبوب حقیقی کا جلوہ حسن دیکھنے اور اس کے لذت بھرے کلمات سننے کے لیے زیادہ بیقرار ہوتے گئے۔ وقت بعثت در حقیقت اظہار نبوت کے لیے بشریت محمدی ﷺ کی حد بلوغ تھی۔ اس حد بلوغ سے پہلے جلوہ حق بے نقاب نہ ہو سکتا تھا۔ ادھر شوق نظارہ مضطرب تھا لیکن قدرت اسے خاص وقت تک منتظر رکھنا چاہتی تھی۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، حجابات اٹھ گئے۔ وہی غار جسے آپ ﷺ نے خلوت کے لیے منتخب کیا تھا حسن محبوب کی جلوہ گاہ بن گئی۔

اسی غار میں قاصد "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" کے لفظوں میں محبوب کا پہلا پیغام لے کر آن پہنچا۔ یہ وہ الفاظ تھے جن سے مخاطبہ الٰہی کا آغاز ہوا اور نور نبوت انتظار کے پردوں کو چاک کرتا ہوا منصۂ شہود عالم پر جلوہ ریز ہو گیا۔ اس کو انبعاث وحی کہہ لیجئے یا انفجار نبوت۔ بہر حال یہ کلام محض افتتاح تھا اس نبوت کے بیج کا جو زمین بشریت کی تہہ میں پک چکا تھا۔ اس طرح حضور علیہ السلام کے منصب نبوت کا اعلان ہو گیا۔

قول اول کے مطابق اقرأ کی اولیت تنزیل کی یہی حقیقت تھی کہ مطلقاً وحی کے افتتاح اور فجر نبوت کے طلوع کے لیے ان کلمات کو اولیت کے شرف سے نوازا گیا۔ لیکن قرآن کو اس غرض و غایت اور اس کی مقصدیت کے حوالے سے دیکھیں تو ابھی ان کلمات سے اس کے آغاز کا مدعا بھی پورا نہ ہوا تھا۔ ان آیات کے ذریعے صاحب نبوت کا باری تعالیٰ سے وہ تعلق قائم ہو گیا جو اعلان نبوت کی شرط ہوتا ہے۔ اسی کو بعثت کہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی غار حراء میں حضور علیہ السلام کی خلوت نشینی بدستور جاری رہی۔ یہاں تک کہ ایک روز غار سے نکل کر واپس گھر تشریف لے جاتے ہوئے وادی میں آپ کو پھر پکارا گیا۔ جس موقع پر حضور علیہ السلام نے وہی جلوہ دوبارہ دیکھا اور آپ پر پھر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ چادر اوڑھ کر گھر میں لیٹ گئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی وحی (اقرأ) کے نزول کے بعد بھی حضور علیہ السلام کو

محویت و انہماک اور خلوت گزینی کی سابقہ حالت کی طرح گزر رہی اور آپ ایک ایک مہینہ غار کی تنہائیوں میں بسر کرتے رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو ابھی کسی چیز کا مزید انتظار تھا۔ کسی مژدہ جانفزا کی آمد کے لیے بیقرار تھے۔ یہ سب معاملات حضور علیہ السلام کی باخبری اور آگہی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس روز چادر لے کر حضور علیہ السلام بستر پر استراحت فرما تھے کہ ندائے محبوب آئی:۔

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ — اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے پیارے!
(المدثر ۷۴:۱'۲) — اٹھ اور گمراہ انسانیت کو خوف دلا دے۔

کتنے پیار بھرے الفاظ تھے۔ ان میں کس قدر اپنائیت تھی۔ ایک بے تکلفی' بے ساختگی اور والہانہ پن تھا۔ جو ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا۔ اس خطاب میں عرصہ دراز کی شناسائی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ وہ پیغام تھا جس نے پہلی مرتبہ حضور علیہ السلام کو فکر و انہماک اور محویت و استغراق کی محیط کیفیت سے نکال لیا۔ اس پیغام نے حضور علیہ السلام کو تبلیغ و تنذیر کا فریضہ سونپا اور آپ نے مسند رسالت پر نزول اجلال فرمایا۔ چونکہ سورۃ المدثر کی ان آیات نے حضور کے دور رسالت کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے انہی آیات کو اولیت تنزیل کے شرف سے بہرہ ور تصور کیا گیا۔ یعنی افتتاح وحی کے بعد یہ وہ آیات تھیں جو سب سے پہلے آپ پر نازل کی گئیں اور انہی سے آپ کے فریضہ رسالت کی ابتداء ہوئی۔

مسند رسالت پر جلوہ فگن ہو جانے کے بعد اب ضرورت اس امر کی تھی کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے کوئی باقاعدہ سبق نازل کیا جائے۔ جسے کتاب الٰہی کے پہلے باب کا شرف حاصل ہو۔ اب تک جو کچھ نازل ہوا تھا یا تو وہ محض افتتاح وحی کی غرض سے تھا یا فریضہ رسالت کی سپردگی کی غرض سے۔ اب تعلیمات الٰہی کے باب اول کی ضرورت تھی جو حیات انسانی کے درس اولین کا درجہ پا سکے۔ اب تک قرآن کی کوئی سورت باقاعدہ اور مکمل طور پر نازل نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ وہی شناسا آواز جو آپ کو پکارتی تھی لیکن آپ جواباً خاموش رہتے تھے۔ اب آپ کے التفات اور جواب پر گویا

ہوئی اور پہلے درس کے طور پر بسم اللہ سمیت سورۂ فاتحہ نازل کردی گئی۔ یہ پہلا باضابطہ سبق تھا۔ جس سے سُوَرِ قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس لئے **الفاتحہ** ہی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت قرار پائی۔ گویا فریضہ رسالت کے سونپ دیئے جانے کے بعد سب سے پہلی تعلیم سورہ فاتحہ کی صورت میں دی گئی اور یہی اس کی حقیقت اولیت ہے۔

انفجار پھوٹنے کو کہتے ہیں اور **انفلاق** چمک اٹھنے کو۔

وحی کا افتتاح نبوت کا **انفجار** تھا یعنی نبوت **افق** بشریت سے پھوٹ پڑی اور تعلیمات الٰہیہ کا آغاز اس کا **انفلاق** تھا یعنی اس سے نبوت **افق** عالم پر چمک اٹھی، **ظلمت** و تاریکی کافور ہونے لگی اور ہر طرف نور ہدایت کا اجالا ہو گیا۔ لہٰذا **انفجار** نبوت کے اعتبار سے **اقرأ** نے شرف اولیت پایا مگر انفلاق نبوت کے اعتبار سے **فاتحہ** شرف سبقت و اولیت لے گئی۔

مدارج نبوت و رسالت میں امتیاز

مذکورہ بالا مسئلہ کو سمجھنے کے لیے نبوت اور رسالت کا امتیاز ذہن نشین رہنا چاہئے۔ نبوت وصف عام ہے اور رسالت وصف خاص۔ یعنی ہر نبی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ رسول بھی ہو لیکن ہر رسول لامحالہ نبی بھی ہوتا ہے۔ انبیاء کی تعداد احادیث میں ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱,۲۴,۰۰۰) مذکور ہوئی ہے۔ بعض روایات میں **دو** لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد بھی آئی ہے۔ لیکن رسولوں کی تعداد "تین سو دس" یا "تین سو تیرہ" یا "تین سو چودہ" بیان کی گئی ہے۔ یہ سب رسول گروہ انبیاء میں سے تھے۔ نبی وہ ذات ہوتی ہے جس پر وحی ہو لیکن رسول اس نبی کو کہتے ہیں جسے باقاعدہ کسی قوم کی طرف فریضہ تبلیغ و تنذیر سونپ کر مبعوث کیا گیا ہو۔ بعض علماء نے رسول کی تعریف میں یہ شرط بھی بیان کی ہے کہ وہ صاحب کتاب (یا صاحب صحیفہ) بھی ہو (شرح عقائد نسفی۔ علامہ تفتازانیؒ)۔ یعنی نبی تو کسی جگہ اور کسی وقت بھی لوگوں کو بربنائے وحی خدا کی توحید، اپنی نبوت اور آخرت وغیرہ کی تعلیم دے سکتا ہے۔ لیکن رسول صرف وہی نبی ہو گا جس کی بعثت کسی

[illegible] قوم یا [illegible] کے لیے [illegible] ہو اور وہ [illegible] کے [illegible] ایک باقاعدہ نظام تعلیمات لے کر ان کی طرف مبعوث کیا گیا ہو۔ نبوت پہلا درجہ ہے جس کی ابتداء محض سلسلہ وحی کے آغاز سے ہو جاتی ہے۔ نبوت کا معنی ہی غیب کی خبر پانا یا غیب کی خبر دینا ہے۔ جب وحی کے ذریعے عالم غیب کا پردہ اٹھتا ہے اور صاحب وحی اس سے باخبر ہوتا ہے۔ تو اسی کو نبوت کہتے ہیں۔ خود قرآنی وحی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

ذَالِکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ (آل عمران، ۳:۴۴)

(اے محبوب) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپکی طرف وحی فرماتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر یوں فرمایا گیا:۔

تِلْکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْھَا اِلَیْکَ مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَا اَنْتَ وَ لَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا (ہود، ۱۱:۴۹)

یہ (بیان ان) غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپکی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپکی قوم۔

مختصر یہ کہ نبوت کا آغاز تو محض انبعاث وحی سے ہی ہو جاتا ہے لیکن منصب رسالت پر فائز ہونا دوسرا مرحلہ ہے جس کے لیے بالعموم الگ حکم دیا جاتا ہے۔ اس امر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے مدارج سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

انبعاث وحی اور نبوت موسوی

جب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام سے اجازت لے کر مدین سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تو آپ کی زوجہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر حضرت شعیب علیہ السلام کی اس طویل المیعاد خدمت کے بعد آغاز پذیر ہوا تھا۔ جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے اپنے شعروں میں یوں اشارہ کیا ہے۔

دم عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

دوران سفر آپ کو آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس واقعے کا بیان قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے:-

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ○ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّىْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ○ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِىَ يٰمُوْسٰى ○ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ○ اِنَّنِىْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِىْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ

(طٰہٰ ۲۰: ۹-۱۴)

اور کیا آپ کو موسیٰ علیہ السلام کی خبر پہنچی۔ جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنی زوجہ سے کہا۔ ٹھہرو میری نظر آگ پر پڑی ہے شاید میں تمہارے لیے اس میں سے کوئی چنگاری لے آؤں۔ یا اس آگ سے اپنی منزل کو پالوں۔ چنانچہ جب وہ آگ کے قریب پہنچا تو اسے ندا آئی۔ "اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں۔ پس اپنے جوتے اتار کر آ۔ بے شک تو اس وقت پاک وادی طوی میں ہے اور میں نے تجھے منتخب کر لیا۔ لہٰذا اب جو تجھے وحی ہوتی ہے وہ کان لگا کر سن۔ بیشک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم رکھ۔

یہ انبعاث وحی تھا یعنی نور حق کی پہلی چمک اور خلاق عالم کی پہلی ندا تھی جو

موسیٰ علیہ السلام [illegible] میں [illegible] آپ پر نبوت [illegible] موسیٰ
علیہ السلام خود بھی اسی لمحے کی انتظار اور اسی حقیقت کی تلاش میں تھے۔ جب وہ کسی ضرورت کے لیے آگ کی طرف گئے تو جانے سے قبل اپنی زوجہ سے فرمایا۔ یہ الفاظ قابل غور ہیں:۔

لَعَلِّیْٓ اٰتِیْکُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی	یا تو میں تمہارے لیے اس آگ میں سے کوئی چنگاری لے آؤں گا یا اس پر سے میں اپنی منزل کو پالوں گا۔
(طٰہٰ، ۲۰:۱۰)	

جملے کا دوسرا حصہ صراحت کے ساتھ اسی بے تابی اور بیقراری کی نشاندہی کر رہا ہے جو انتظار نبوت کے لیے بشریت کی حد بلوغ پر پہنچ کر انبیاء علیہم السلام کو لاحق ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پردہ غیاب اٹھا اور ناموس اکبر نے اپنا جلوہ حسن ظاہر کر دیا۔ فجر نبوت طلوع ہو گئی اور اس پہلی وحی سے نبوت موسوی کا اعلان ہو گیا۔ یہ واقعہ آپ کی بعثت قرار پایا۔

رسالت موسوی کا آغاز

مقام نبوت کے باوجود ابھی آپ کو ایک خصوصی مشن سونپا جانا تھا اور اس مشن کی سپردگی سے آپ کی رسالت کا آغاز ہوتا تھا۔ سورہ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیات کے بعد یہ بیان ہوا ہے کہ پھر آپ کو معجزات عطا کیے گئے ''عصاء موسوی'' اور ''ید بیضا'' کے خوارق سے نوازے گئے۔ اب پھر ندا آئی:۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ○ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ○ هٰرُوْنَ اَخِی ○ اشْدُدْ بِهٖ	اے موسیٰ! اب تو فرعون کے پاس جا، وہ بے شک باغی ہو چکا ہے۔ موسیٰ نے کہا! اے میرے رب میرے لیے میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرا کام آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول

اُزْرِیْ وَ اَشْرِکْہُ فِیْ اَمْرِیْ ○

(طٰہٰ ۲۰: ۲۴۔۳۲)

[illegible] کہ وہ میری بات سمجھیں اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر بنا دے اور وہ میرا بھائی ہارون ہو۔ اس سے میری کمر مضبوط کر اور اسے میرے کام میں شریک کر۔

اس وحی کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب رسالت عطا کر دیا گیا۔ یہی وہ فریضہ رسالت تھا جس کے بوجھ کے پیش نظر آپ نے باری تعالیٰ سے خصوصی دعا کی۔ چنانچہ پہلی وحی محض انفجار و افتتاح تھا۔ جس سے صرف نبوت کا اظہار مقصود تھا اور دوسری وحی فریضہ رسالت کے آغاز سے متعلق تھی۔ جس سے انطلاق نبوت مقصود تھا۔ لہذا "اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ" کے الفاظ باعتبار نبوت شرف اولیت سے ہمکنار ہوئے اور "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى" کے الفاظ باعتبار رسالت شرف اولیت سے نوازے گئے۔

نبوت و رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیت تنزیل

مذکورہ بالا تمثیل سے اولیت نزول قرآن کی حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے۔ ہم نے شروع میں نزول قرآن کی اولیت کے مسئلے پر تین اقوال درج کیے تھے۔ جن میں سے ایک **اقرأ** کے بارے میں تھا، دوسرا **المدثر** کے بارے میں اور تیسرا **الفاتحہ** کے بارے میں۔ **بسم اللہ** سے متعلق روایت **الفاتحہ** والے قول ہی کا حصہ تھی۔ کوئی الگ قول نہ تھا۔ جیسے کہ ہم نے پہلے عرض کیا۔ ان تمام اقوال میں قطعاً کوئی تضاد و تنافی یا اختلاف و تناقض نہیں۔ ان میں ہر قول ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشوں اور ایک ہی سفر کے مختلف مرحلوں پر روشنی ڈال رہا ہے۔

قول اول

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" سب سے پہلی ندا تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[illegible] "اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ" کی صدا کی مانند نبوت محمدی ﷺ کو مرتبہ بشریت میں ظہور رملا۔ یہ پہلی وحی صرف افتتاح و انفجار تھا اور اس کے ذریعے محض اعلان نبوت مقصود تھا۔

لہذا بعثت و اعلان نبوت کے اعتبار سے یہی وحی نزول قرآن میں شرف اولیت سے ہمکنار ہوئی۔

قول ثانی

"يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ" یہ وہ ندا تھی جس نے "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى" کی مانند حضور ﷺ کو فریضہ رسالت کا بار مقدس عطا کر دیا۔ اس وحی سے آپ کی رسالت کا آغاز ہوا اور آپ اپنی قوم پر تبلیغ و تنذیر کے لیے مامور کر دیئے گئے۔

لہذا انفجار نبوت کے بعد حکم رسالت کے اعتبار سے یہی وحی نزول قرآن میں شرف اولیت سے ہمکنار ہوئی۔

قول ثالث

پہلے دونوں اقوال میں مذکور اولیت صرف نبی اکرم ﷺ کے نبوت اور رسالت کے انفجار و انبعاث کے حوالے سے تھی۔ ان کا تعلق حضور علیہ السلام کے ذاتی مدارج و مناصب سے تھا۔ جب یہ کام ہو چکا تو اب فی الواقع سلسلہ تبلیغ کا آغاز مقصود تھا۔ چنانچہ فریضہ رسالت پر مامور ہو جانے کے بعد سب سے پہلے جو سورت نازل کی گئی وہ سورہ فاتحہ تھی۔ گویا نزول قرآن کا وہ آغاز جس سے دنیائے انسانیت کو باقاعدہ طور پر دین حق کی تعلیمات و ہدایات کا پہلا اجمالی تعارف کرایا گیا۔ سورہ فاتحہ سے ہوا۔

اس لیے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آغاز رسالت کے بعد نزول قرآن میں شرف اولیت سورہ فاتحہ کو ہی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے دونوں مرحلوں میں **اقرأ** یا **المدثر** کوئی بھی سورت پوری نازل نہ ہوئی۔ "اعلان نبوت" اور "آغاز رسالت" دونوں کام پانچ پانچ آیات کے نزول سے لیے گئے اور ان دونوں سورتوں کی

تکمیل بعد میں جا کر ہوئی۔ مگر سورہ فاتحہ وہ پہلی سورت تھی جو بیک وقت پوری کی پوری نازل ہوئی اس لیے بھی باقی تمام سورتوں کے مقابلے میں اس شرف اولیت حاصل ہے۔

مذکورہ بالا تینوں مراتب کو مزید عام فہم انداز میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ "**اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ**" کے ذریعے ذات حق نے وجود نبوت کو اپنی طرف مخاطب کیا اور اس سے اپنا علاقہ وحی قائم کر لیا۔ جب باقاعدہ رابطہ قائم ہو چکا تو اسے "**یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ○ قُمْ فَاَنْذِرْ**" کے حکم کے ذریعے تبلیغ و رسالت کا فریضہ سونپ دیا اور اور اسے خلق خدا کی ہدایت و رہنمائی کی طرف متوجہ کر دیا۔ جب وجود رسالت عشق الٰہی، معرفت حق اور تعلق باللہ کی کیفیات میں انہماک و استغراق کے مراحل سے نکل کر مخلوق کی حالت سنوارنے کے طرف متوجہ ہو گیا تو اب سب سے پہلا سبق جو سورت قرآنی کے نمونے میں نازل کیا گیا سورہ فاتحہ کا تھا۔ اس لحاظ سے اسی کو اولیت تنزیل کا مقام حاصل ہوا اور اسی کو بطور نمونہ کتابی ترتیب میں بھی سب سے اول رکھا گیا۔

امام جلال الدین سیوطیؒ پہلے دو اقوال کی نسبت علماء کی یہ رائے لکھتے ہیں:-

اول ما نزل للنبوة "اقرأ" و اول ما نزل للرسالة "يايها المدثر" (الاتقان، ۱:۲۵)

جو چیز نبوت کے لیے سب سے پہلے نازل ہوئی "اقرأ" ہے اور جو چیز رسالت کے لیے سب سے پہلے نازل ہوئی "يايها المدثر" ہے۔

اور ہمارے خیال میں جو چیز قرآن کے لیے سب سے پہلے نازل ہوئی "الفاتحہ" ہے۔

باب-۳

سورہ فاتحہ
اور
حیات انسانی کا اعتقادی پہلو

سورہ فاتحہ کے اسماء اور ان کی معنوی خصوصیات کے باب میں سورت کے بعض مضامین اجمالی طور پر بیان ہو چکے ہیں لیکن اب اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس سے قبل اولیت نزول قرآن کے اعتبار سے سورہ فاتحہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس سورت کا نزول اور تدوین' دونوں کے لحاظ سے سب سے پہلی سورت ہونا اس کے مطالب و مضامین کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتا ہے۔ آیئے اب اس سورت کے مضامین کا اجمالی جائزہ لیں۔ تاکہ بعد ازاں اس کے معانی و مطالب کی جزئیات اور تفاصیل کو سمجھنے اور تعلیمات کے لحاظ سے اس کے صحیح مقام کو متعین کرنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلے کے پہلے مضمون کا عنوان حسب ذیل ہے:۔

مضمون سورت اور حیات انسانی کا اعتقادی پہلو

تاریخ انسانی کے آغاز سے آج تک انسان مختلف قسم کی اعتقادی گمراہیوں کا شکار ہوتا رہا ہے۔ تمام گمراہیوں کی اصل وجہ اس کا ان تین بنیادی حقائق سے بے خبر ہونا تھا:۔

۱۔ توحید' ۲۔ رسالت' اور ۳۔ آخرت

انبیاء و رسل ہر دور میں طبقات انسانی کی طرف اس لیے مبعوث ہوتے رہے کہ انھیں ان حقائق کی صحیح معرفت عطا کر کے راہ حق پر گامزن کر سکیں۔

کیونکہ تصور توحید کے بغیر انسان اپنی زندگی کے آغاز اور اس کی حقیقت کو صحیح طور پر نہیں جان سکتا تھا۔ تصور رسالت کے بغیر انسان اپنی زندگی اور اعمال کو صحیح سمت پر نہیں ڈال سکتا تھا اور تصور آخرت کے بغیر انسان زندگی کے انجام اور اس کی نوعیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ گویا ان تینوں حقائق کا علم اس قدر ضروری تھا کہ اس کے بغیر حیات انسانی کا آغاز' دوران اور انجام سب کچھ مخفی و نامعلوم تھا عقل انسانی ان ہی

حقیقتوں کی نسبت قیاس آرائیاں کرتی رہی جس کی بناء پر مختلف فلسفیانہ افکار و خیالات اور مذہبی معتقدات معرض وجود میں آئے۔ درج ذیل سوالات تمام ادوار میں کم و بیش ہر فلسفہ و علم کا موضوع بنے رہے کہ:-

☆ حیات انسانی کا آغاز کس طرح ہوا؟ کیا یہ از خود وجود میں آئی یا کسی نے اسے تخلیق کیا؟ اگر یہ از خود وجود میں آئی تو اس کا سبب کیا تھا؟ اگر کسی نے اسے تخلیق کیا تو وہ تخلیق کرنے والا کون تھا؟

انسان کا مقصد تخلیق اور دوران حیات اس کی جدوجہد کا نصب العین کیا ہے؟ انسانی زندگی کے فضائل کیا ہیں اور ان کی بقاو کمال کی شرط کیا ہے؟ کونسا طرز عمل اور نمونہ حیات پسندیدہ ہے اور کونسا ناپسندیدہ؟

☆ حیات انسانی کا انجام کیا ہوگا؟ موت کیا چیز ہے؟ کیا موت 'حیات انسانی کو کلیۃً فنا اور معدوم کردیتی ہے یا محض سلسلہ حیات میں تبدیلی پیدا کر کے کسی نئے دور کا آغاز کرتی ہے؟

☆ پہلی قسم کے سوالات کا جواب تصور توحید میں مضمر ہے۔

☆ دوسری قسم کے سوالات کا جواب تصور رسالت میں مضمر ہے۔

☆ اور تیسری قسم کے سوالات کا جواب تصور آخرت میں مضمر ہے۔

سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیات صراحت کے ساتھ ان ہی تصورات پر مبنی حیات انسانی کے اعتقادی پہلو کی اصلاح کرتی ہیں۔ اور مذکورہ بالا تینوں حقائق پر روشنی ڈالتی ہیں کیونکہ یہی تین تصورات حقیقت میں انسان کے جملہ عقائد کی اساس ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے استدلال توحید

سورہ فاتحہ کی یہ پہلی آیت نہ صرف عقیدہ توحید بیان کر رہی ہے بلکہ خود توحید پر زبردست دلیل بھی ہے۔ آیت مذکورہ میں فرمایا گیا ہے۔ "سب تعریفوں کا مستحق اللہ ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے دو امور کو ثابت کیا گیا:-

۱۔ استحقاق حمد -------- کہ وہی ہر قسم کی حمد کا حقدار ہے۔

۲۔ ربوبیت عامہ ------- کہ وہی ساری کائنات کا مالک اور پروردگار ہے۔

حمد حقیقت میں کسی کی خوبی اور کمال کے اعتراف کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے عبادت، حمد کی اعلیٰ ترین صورت قرار پائی۔ جب فی الحقیقت عام حمد کا مستحق بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تو عالم امکان میں حمد کی سب سے اعلیٰ اور بلند ترین صورت یعنی عبادت کا مستحق کوئی اور کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس لیے جو ذات تمام تعریفوں کی سزاوار ہے عبادت کی حقدار بھی وہی ہو گی۔ اسی تصور کا نام توحید ہے۔

ربوبیت دلیل توحید ہے

اس آیت میں باری تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا بھی ذکر ہے۔ "**ربّ العٰلمین**" میں ساری کائنات کے خالق و مالک اور پروردگار کا معنی پایا جاتا ہے۔ یہ صفت بھی تصور توحید کی نہایت قوی دلیل ہے کیونکہ جو ہستی ہر ایک کی خالق ہو۔ اس کی موت و حیات کی مالک ہو اور اس کی پرورش کی ذمہ دار بھی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ انسان کی جبین نیاز عاجزی، شکر اور احسانمندی کے ساتھ صرف اسی کے سامنے ہی جھک سکتی ہے کسی اور کے سامنے نہیں۔

سورہ فاتحہ کے کلمہ اولین نے ہی انسان کو اس کے آغاز اور حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ وہ یہ نہ سمجھتا رہے کہ اس کی زندگی از خود وجود میں آگئی تھی بلکہ اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اسے اور دیگر مخلوقات کائنات کو خلعت وجود سے سرفراز کرنے والی "اللہ تعالیٰ کی ذات" ہے اور وہی اسے پرورش کی تمام منزلوں سے گزار رہی ہے۔ چنانچہ بندے کو چاہیے کہ وہ ہر حال میں اس کا احسان مند رہے۔ اور اسی کی بارگاہ میں سجدہ نیاز بجالاتا رہے

قرآن حکیم نے اسی استدلال کو تصور توحید کی تائید میں استعمال کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ؕ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ

(فاطر ۳۵:۳)

اے بنی نوع انسان! اللہ نے تمہیں اپنی جن نعمتوں سے بہرہ ور کیا ہے انہیں یاد کرو۔ (کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق بھی ہے؟ جو تمہیں زمین و آسمان سے رزق دے رہا ہو؟ (نہیں تو پھر) کوئی مستحق عبادت نہیں سوائے اس ذات کے۔ پس (اس کے باوجود اس سے روگردانی کرکے) تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنی خالقیت و ربوبیت اور اپنے انعام و احسان کے تذکرے سے اپنی توحید پر کتنا عمدہ استدلال پیش کیا ہے۔ یہی مضمون سورہ فاتحہ کی پہلی آیت میں مندرج ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ ۲:۲۱-۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو (بھی) جو تم سے پیشتر تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمانوں کی طرف سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے تمہارے کھانے کے لئے (انواع و اقسام کے) پھل پیدا کئے۔ پس تم اللہ کے لئے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم (حقیقت حال) جانتے ہو۔

مذکورہ بالا آیات میں باری تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت اور اس کی نعمتوں کو دلیل توحید قرار دیا گیا ہے۔ اس تصور سے انسانی اعتقاد کے اس پہلو کی اصلاح ہوتی ہے

کہ ساری کائنات کا خالق و مالک صرف رب ذوالجلال ہے۔ تمام مظاہر حیات مثلاً چاند سورج، آگ، ہوا، پانی، مٹی، پتھر، حیوان، انسان اور فرشتے وغیرہ جن کی مختلف ادوار میں پرستش کی جاتی رہی ہے سب کچھ اللہ کے پیدا کردہ اور پروردہ ہیں۔ اس لیے ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اسے معبود تصور کیا جا سکے۔ جس طرح خالق، مالک اور پروردگار ایک ہی ہے، اسی طرح عبادت کا مستحق اور سزاوار بھی وہی ایک ہی ہے۔ سورہ فاتحہ کا پہلا اعلان کہ "اللہ تعالیٰ سب کا رب ہے اور ساری کائنات اس کی مخلوق و مربوب" اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ عالم ہستی کا کوئی وجود بھی صفت الوہیت سے بہرور نہیں ہو سکتا۔ یہ تاج صرف "**ربّ العٰلمین**" کو زیبا ہے اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔

"الرَّحمٰنِ الرَّحِیم" سے استدلال رسالت

انسانی اعتقاد کا دوسرا ستون تصور رسالت ہے۔ ربوبیت الٰہیہ خود رسالت کی مقتضی ہے۔ باری تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا اور اس کی پرورش کی ذمہ داری لی۔ اب حیات انسانی کے معرض وجود میں آنے کے بعد اس کی بقاء کا مرحلہ تھا۔ جو اس کی رحمت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس مرحلے پر رحمت الٰہی کی ایسی صورت مطلوب تھی جو انسانوں کو وہ ہدایت، روشنی اور طرز عمل مہیا کر دے جس کے باعث وہ نہ صرف کامیابی سے زندہ رہ سکیں بلکہ اپنے مقصد تخلیق اور مقصد زیست کو بھی پا سکیں۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جس ذات نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی پرورش کی ذمہ داری بھی لی وہ انہیں "ضابطۂ بقا" جیسی اہم ضرورت اور نعمت سے محروم رکھے۔

چنانچہ ربوبیت کے ساتھ "**الرحمٰن الرحیم**" کے اعلان نے باری تعالیٰ کی اسی "رحمت" کی نشاندہی کر دی۔ جیسے کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں رحمت کی وہ صورت مطلوب تھی جس کے ذریعے بنی نوع انسان کو اپنی پیدائش کے مقصد اور غرض و غایت کی خبر ہو سکے۔ جس کے ذریعے انہیں اپنی زندگی کی جدوجہد کے اصل نصب العین

کی معرفت حاصل ہو سکے- جس کے ذریعے ان کو فضائل و رذائل حیات میں امتیاز کا شعور مل سکے- جس کے ذریعے ان پر پسندیدہ و ناپسندیدہ طرز ہائے عمل کا فرق واضح ہو سکے اور وہ اپنی جدوجہد کا صحیح رخ متعین کر سکیں- صاف ظاہر ہے کہ یہ رحمت "وحی وہدایت ربانی" کی صورت میں ہی ممکن تھی' اس کے بغیر نہیں- چنانچہ اسی رحمت کا نام رسالت ہے جس کے باعث رب کائنات نے انسانوں کو "ضابطہ بقا" عطا کیا- اس لحاظ سے "رسالت" ربوبیت الٰہی کا ضروری تقاضا اور رحمانیت و رحیمیت الٰہی کا عملی وجود قرار پائی-

اسی وجہ سے رسالت کے پیکر اتم ﷺ کو باری تعالٰی نے سراسر "رحمت" کے لقب سے سرفراز فرمایا جیسا کہ قرآن حکیم میں مذکور ہے:-

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

(سورۃ الانبیاء' ۲۱: ۱۰۷)

اے رسول اللہ ﷺ! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر ساری کائنات کے لیے سراسر رحمت بنا کر-

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:-

لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(النساء' ۴: ۸۳)

اے لوگو! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (یعنی رسول اکرم ﷺ مبعوث نہ ہوتے) تو یقیناً سوائے چند ایک کے تم سب شیطان کی پیروی کرنے لگتے-

علامہ ماوردیؒ اور زرقانیؒ فرماتے ہیں کہ بے شک نبی اکرم ﷺ کی ذات ہی خدا کا فضل اور اس کی رحمت تھی- کیونکہ اسی کے باعث انسانیت کو راہ ہدایت نصیب ہوئی-

استدلال رسالت کی دوسری وجہ

سورہ فاتحہ کی دوسری آیت "الرحمٰن الرحیم" کا مبداء استدلال اس وجہ

[illegible]
کی پرورش کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیسری آیت میں بروز قیامت جزا و سزا کا ذکر ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ "تخلیق و پرورش" اور "حساب و کتاب" (یعنی جزاء و سزا) کے درمیان "بقائے حیات انسانی" کا ہی مرحلہ ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں جزا و سزا کے دن باز پرسی اور جواب طلبی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ امر بڑا واضح ہے کہ زندگی بسر کرنے کا ضابطہ اور ہدایت مہیا کیے بغیر انسانوں سے جواب طلبی اور جزا و سزا کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ انسانوں کو رب کائنات نے پیدا کر کے ذرائع و وسائل حیات تو مہیا کر دیئے ہوں کہ یہ کھاؤ اور پیو اور زندگی گزارو مگر انہیں اپنی وحی و ہدایت کی نعمت سے سرفراز نہ فرمایا ہو اور نہ ہی انہیں کوئی ضابطہ زندگی اور نمونہ حیات تجویز کیا ہو کہ جس کے مطابق زندگی بسر کرنا نیکی اور جس کے خلاف زندگی بسر کرنا گناہ قرار پائے۔ پھر اس کے باوجود روز قیامت ان سے حساب و کتاب بھی لیا جائے، جواب طلبی بھی کی جائے اور انہیں جزا و سزا بھی دی جائے۔ عقل انسانی اس تصور کو قبول نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جزا و سزا، جواب طلبی پر ہوتی ہے اور جواب طلبی ذمہ داری پر ہوتی ہے اور ذمہ داری پہلے سے دیئے گئے ضابطے کے ذریعے متعین ہوتی ہے۔ اگر سرے سے کوئی ضابطہ زندگی ہی نہ دیا گیا ہو تو ذمہ داری کیسی، اور اگر ذمہ داری نہ ہو تو جواب طلبی کیسی اور اگر جواب طلبی نہ ہو تو جزا و سزا کیسی؟

لہٰذا ضروری تھا کہ تخلیق و پرورش انسانیت کے ساتھ ساتھ جزا و سزا کے مرحلے سے پہلے انسانوں کو ہدایت ربانی پر مشتمل ضابطہ زندگی بھی عطا کیا جائے۔ جس کی بنیاد پر ان سے باز پرس ہو سکے۔ پس انسانوں کو وحی و ہدایت ربانی پر مشتمل ضابطہ زندگی عطا کرنے کا ذریعہ "رسالت" کی صورت میں قائم کر دیا گیا اور یہی نظام رسالت خدا کی رحمت کی اعلیٰ ترین صورت تھی۔ اس لیے اس رحمت کا ذکر "تخلیق و پرورش انسانیت" اور "یوم جزا و سزا" کے درمیان "**الرحمٰن الرحیم**" کے عنوان سے کیا گیا۔

قرآنی استدلال

قرآن نے کئی اور مقامات پر بھی اسی استدلال کو اپنایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ

(الانعام ۶:۹۱)

اور انہوں نے (یعنی یہود نے) اللہ کی وہ قدر نہ جانی جیسی قدر جانا چاہیے تھی۔ جب انہوں نے یہ کہہ (کر رسالت محمدی ﷺ کا انکار کر) دیا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری۔

کسی بندے پر ہدایت اور وحی کا نازل ہونا ہی تو نبوت و رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے لہٰذا معنی یہ ہوا کہ انہوں نے رسالت کا انکار کر کے خدا کی کوئی قدر نہ کی۔ آیت مذکورہ یہ اعلان کر رہی ہے کہ وجود رسالت کا انکار کر کے انہوں نے باری تعالیٰ کی خالقیت، ربوبیت، رحمت بلکہ تمام عظمت و قدرت کا انکار کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت اور رحمانیت و رحیمیت کے بیان کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ اس نے نسل انسانی کی ہدایت کے لیے رسالت کا نظام قائم نہیں کیا۔ ذرا غور فرمائیے یہ کیسی "خالقیت" ہے کہ بندوں کو پیدا کر کے ان کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے اسباب تو فراہم کرے لیکن عقل اور روح کی ضرورتوں کے لیے کوئی ہدایت عطا نہ کرے۔ یہ کیسی "ربوبیت" ہے کہ خاک کے ہر ذرے کی سیرابی اور مخلوق کے ہر فرد کی کارسازی کا سامان تو مہیا کرے لیکن اشرف المخلوقات کی روحانی سعادت اور اخلاقی کمال کی خاطر کوئی سرچشمہ پیدا نہ کرے۔ یہ کیسی "رحمانیت" ہے کہ کائنات میں اجسام نباتات کی پرورش کی لیے تو آسمان سے پانی برسائے۔ لیکن ارواح بنی آدم کی پرورش کے لیے قطرۂ فیض بھی مہیا نہ کرے۔ جب زمین سبزی و شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو اس کی باران رحمت برس کر اسے دوبارہ زندگی کی برکتوں سے مالا مال کر دیتی ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ عالم انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے

محروم ہو کر روحانی موت کا شکار ہو جائے کہ اس کی بارانِ رحمت برس کر بھی وہ روحانی زندگی کی نعمتوں سے بہرہ ور نہ کر سکے۔ یہ تصور اس کی ربوبیت اور شانِ رحمت کے سراسر خلاف ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اے لوگو! انعام رسالت کا انکار کر کے تم نے میری کوئی قدر نہیں کی۔ کیونکہ نظام رسالت' باری تعالٰی کے نظام ربوبیت کے کامل ہونے کی سب سے بڑی اور قوی دلیل تھا۔ جب اس دلیل کا انکار کر دیا گیا تو دعوے کی قدر شناسی کیونکر ممکن رہ سکتی تھی۔

واسطۂ رسالت کے بغیر ایمان باللہ مردود ہے

باری تعالٰی واسطہ رسالت کے بغیر اپنی توحید اور الوہیت و ربوبیت پر لایا ہوا ایمان بھی رد فرما دیتے ہیں۔ جیساکہ قرآن مجید میں مذکور ہے:۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا

(النساء ' ۴:۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف آؤ اور رسول کی طرف آجاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیں۔

اس آیت میں دو دعوتیں مذکور ہیں۔ "دعوت الی اللہ" اور "دعوت الی الرسول" یعنی ایک دعوت خدا کی نازل کردہ کتاب اور اس کی حاکمیت کی طرف ہے اور دوسری بارگاہ رسالتمآب ﷺ کی طرف۔ اب قرآن علامت منافقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا

اے محبوب! ﷺ آپ دیکھیں گے منافقوں کا وطیرہ یہ ہے کہ (میری حاکمیت' میری کتاب اور میرے نازل کردہ احکام کے سامنے جھکنے سے نہیں گھبراتے بلکہ) صرف آپ کی بارگاہ میں

[illegible] اجتناب کرتے ہیں

ان کا گمان یہ ہے کہ شاید واسطہ رسالت کے بغیر ہی ہمارا ایمان باللہ قبول کر لیا جائے گا۔ واسطہ رسول ﷺ کو تسلیم کئے بغیر ہمارا دعویٰ توحید شرف قبولیت پا لے گا۔ حالانکہ رسول ﷺ کی بارگاہ عظمت پناہ میں سرنیاز خم کئے بغیر ان کا ایمان بالتوحید، ایمان نہیں بلکہ منافقت ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی توحید، اس کی خالقیت و ربوبیت، اس کی نازل کردہ کتاب اور احکام پر ایمان لانا تب ہی معتبر اور مقبول ہو سکتا ہے اگر وہ واسطہ رسالت سے لایا گیا ہو۔ اگر توحید الٰہی پر ایمان بحذف غلامیٔ رسالت ہو تو وہ عند اللہ مردود اور نامقبول ہو گا۔

اس لیے توحید و ربوبیت الٰہیہ کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ اپنا اقرار بھی بذریعہ رسالت کروائے اور اظہار و اعلان بھی جیسا کہ سورہ اخلاص کے کلمات اس حقیقت پر شاہد عادل ہیں:-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ ○ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○

(الاخلاص، ۱۱۲: ۱-۴)

(اے نبی مکرم) آپ فرما دیجئے وہ اللہ ہے جو یکتا ہے اللہ سب سے بے نیاز، سب کی پناہ اور سب پر فائق ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔

اس سورت کے انداز بیان نے مذکورہ بالا حقیقت کو مزید واضح کر دیا۔ یہ سورت خالصتاً بیان توحید پر مشتمل تھی۔ ذات حق کی توصیف کے سوا اور کوئی مضمون اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ مستزاد یہ کہ اس اعلان سے قبل بھی تصور توحید جملہ اعتبارات سے مکمل تھا۔ اس کو اپنی تکمیل کے لیے کسی کے ماننے یا اعلان کرنے کی حاجت نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود قدرت الٰہیہ نے چاہا کہ میری توحید اور ربوبیت و الوہیت کا اعلان ہو اور اس کو ہر سمت ظہور ملے۔ اب اس مقصد کی خاطر بات یوں بھی کی جا سکتی تھی۔ **ھو اللّٰہ احد** (وہ اللہ ایک ہے) لیکن نہیں۔ باری تعالیٰ نے اپنی توحید و

الوہیت کا اعلان بھی اس انداز سے پسند فرمایا۔ "کہ اے زبان رسالت! تو حرکت میں آ اور اپنی ادائے دلنوازی سے کہہ دے "وہ اللہ ایک ہے" بیان توحید کا آغاز کلمہ "قل" (تو کہہ دے) سے کیا گیا۔ یعنی ذات حق اپنی توحید کا ذکر بھی زبان رسالت سے سننا چاہتی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ "اے محبوب ﷺ! اپنی وحدت و الوہیت کے بیان کا جو لطف اور مزہ تیری زبان سے سننے میں ہے وہ کسی اور جگہ کہاں، اس لیے جب تو میرے ایک ہونے کا اعلان کرے گا تو میں اس اعلان کو "توحید" بنا لوں گا۔" وحدت اور توحید" میں فرق یہی ہے کہ واسطہ رسالت کے بغیر اقرار وحدت و الوہیت کو قرآن "منافقت" قرار دے رہا ہے۔

رسالت بنائے ایمان توحید ہے

اوپر تو یہ مذکور تھا کہ واسطہ رسالت کے بغیر ایمان باللہ مردود و نامقبول ہے اب ہم قرآن مجید کے حوالے سے ایجابی طرز پر اس امر کی تلاش کرتے ہیں کہ "توحید" پر ایمان کا اصل ذریعہ اور بنیاد کیا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے اپنے مذہب کی دعوت دی اور کہا کہ ہمارے راستے کو اپنا لو۔ یہی راہ ہدایت ہے جس کا جواب قرآن نے یوں دیا۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ط قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(البقرہ، ۲:۱۳۵)

اور (اہل کتاب) کہتے ہیں یہودی یا نصرانی ہو جاؤ۔ ہدایت پا جاؤ گے۔ آپ فرما دیں کہ (نہیں بلکہ ہم تو اس) ابراہیم کا دین اختیار کئے ہوئے ہیں جو ہر باطل سے جدا صرف اللہ کی طرف متوجہ تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اب اس آیت کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے بغرض ہدایت اپنے اپنے مذہب کی دعوت دی تھی لیکن قرآن ان کی دعوت کو رد کر کے "دین حق" یعنی "اسلام" کی دعوت دینا چاہتا ہے اور اس دعوت کا اعلان بزبان رسالتمآب

صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کرایا جارہا ہے- "اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! فرمادیجئے کہ ہدایت مذہب ابراہیم کی پیروی سے نصیب ہو گی"- یہاں بات یوں بھی کی جا سکتی تھی کہ "آؤ دین اسلام کی طرف- ہدایت یہودیت اور نصرانیت کے پاس نہیں بلکہ" "اسلام" کے دامن میں ہے"- بے شک بات اب بھی فی الحقیقت یہی کی گئی ہے لیکن اسلوب مختلف ہے- اسلام کو یا دین ہدایت کو "مذہب ابراہیمی" کے عنوان سے بیان کیا گیا اور ساتھ ہی فرمایا گیا:-

حَنِیۡفًا وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ — وہ ابراہیم علیہ السلام جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرک نہ تھے-

اس وضاحت سے یہودیت و نصرانیت کی گمراہی اور شرک کے ساتھ ان کی تلویث اور آلودگی کا اشارہ بھی مل گیا اور تصور توحید کا بیان بھی ہو گیا- یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے پیغمبر تھے جن کا عمل اور شعار "ہر قسم کے کفر و باطل سے واضح ٹکراؤ" اور "توحید" پر مبنی تھا- اگر باری تعالیٰ چاہتے تو یہاں دین حق یا اسلام کے تعارف کے لیے عقیدہ توحید کو ہی براہ راست بیان فرما دیتے- لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ دین اسلام کا تشخص و امتیاز نسبت رسالت سے قائم کیا گیا اور توحید کا بیان بھی نبوت و رسالت کے عمل اور وطیرہ و شعار کے واسطے سے کیا گیا تاکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ اسلام جس توحید کی تعلیم دیتا ہے وہ رسالت کے واسطے سے شرف قبولیت پاتی ہے اور واسطہ رسالت کے بغیر تمام عقائد پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتے ہیں- عقیدے کا اصل مدعا اور منتہائے مقصود توحید ہی ہے لیکن اس تک رسائی کی صورت صرف واسطہ رسالت ہے- قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات سے پہلے اپنے بیٹوں سے سوال کیا:-

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ — تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے

(البقرہ ۲:۱۳۳)

وہ اپنی تسلی و اطمینان قلب کے لیے جاننا چاہتے تھے کہ میری اولاد میری تعلیم سے کس قدر صحیح نتیجہ تک پہنچ چکی ہے- توحید باری تعالیٰ کا تصور کس حد تک اور کس

انداز سے ان کے دل و دماغ میں راسخ ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ جواب دیا:

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ‘ ۲: ۱۳۳)	تو انہوں نے کہا ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم (سب) اسی کے فرماں بردار رہیں گے۔

کتنا پیارا اور معرفت سے لبریز جواب تھا جسے قرآن نے آیت کے طور پر اپنے سینے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ غور فرمایئے۔ مقصود تو محض خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کے عزم کا اظہار تھا۔ جسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا تھا کہ "صرف معبود واحد اللہ کی عبادت کریں گے"۔ لیکن پیغمبر علیہ السلام یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا میرے بیٹے توحید پر ایمان کا اظہار بلاواسطہ کرتے ہیں یا واسطہ رسالت سے کرتے ہیں۔ یعنی ذات احد سے اپنا رشتہ و تعلق از خود قائم کرنا چاہتے ہیں یا ذریعہ رسالت کی بنا پر۔ کیونکہ توحید و الوہیت پر واسطہ رسالت کے بغیر ایمان لانا خطرے سے خالی نہ تھا اور یعقوب علیہ السلام اسی امر کا امتحان لینا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ توحید کی معرفت بھی واسطہ رسالت و نبوت سے متحقق ہو۔ پس ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے جواب دیا۔ "ہم اس معبود واحد کی عبادت کریں گے جس کی خبر ہمیں آپ نے اور آپ سے پہلے کے انبیاء و رسل نے دی اور جس کی عبادت وہ خود بھی کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ معبود برحق تو صرف ایک ہی ہے لیکن واسطہ رسالت کے بغیر نہ کسی کو اس کے وجود کا علم تھا نہ اس کی الوہیت کا‘ نہ اس کی توحید کی معرفت تھی نہ اس کی ربوبیت کی۔ جب کسی کو بھی از خود زبان نبوت و رسالت کی شہادت کے بغیر نہ خدا کی ذات و صفات کا شعور تھا اور نہ اس کے استحقاق عبادت کا تو آخر انسان کی جبین نیاز اپنے آپ کس طرح اس کے سامنے جھک جاتی۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام کے صاحب زادوں نے ان کی خواہش کے مطابق اسی رب کی الوہیت و توحید کا ذکر کیا۔ جس کی معرفت انھیں ذریعہ رسالت سے نصیب ہوئی تھی۔ قرآن نے اس جواب کو اپنی ابدی تعلیم کے طور پر اسی لیے محفوظ کر لیا کہ انسانیت

ابدالآباد تک اس سبق کو یاد رکھ سکے کہ اسلام کے نزدیک توحید صرف واسطہ رسالت سے ہی مقبول ہے۔ دین وملت کا تشخص اس کی بقاء واستحکام اور اس کا شرف وامتیاز بھی نسبت رسالت سے ہی ہے۔ بقول اقبال"

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید وز رسالت درتن ما جاں دمید
ما زحکم نسبت او ملتیم اہل عالم را پیام رحمتیم
از رسالت ہم نوا گشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
تا نہ ایں وحدت ز دست ما رود ہستی ما با ابد ہمدم شود

آئمہ و محدثین اسلام اس تصور کو ہمیشہ بڑی شدومد کے ساتھ بیان کرتے رہے ہیں۔ اس کی تفصیل بعد میں کسی موقع پر آئے گی۔ اس وقت ہم صرف علامہ ابن تیمیہ کے ایک قول پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

لان الامة لا يصلون ما بينهم و بين ربهم الا بواسطة الرسول ليس لاحد منهم طريق غيره و لا سبب سواه
(الصارم المسلول:۴۱)

کیونکہ امت اپنے اور رب کے درمیان تعلق کو بغیر واسطہ رسالت کے نہیں پا سکتی۔ کسی شخص کے لیے بھی خدا تک رسائی کا نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی سبب سوائے رسول ﷺ کے واسطہ اور ذریعہ کے۔

مذکورہ بالا شواہد سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی کہ توحید و ربوبیت کا اظہار بغیر واسطہ رسالت کے ممکن نہ تھا اس لیے سورہ فاتحہ میں بیان ربوبیت کے بعد جس رحمت الٰہی کا ذکر کیا گیا وہ یقیناً واسطہ رسالت کی رحمت تھی۔ لہٰذا سورہ فاتحہ کی دوسری آیت انسانی اعتقاد کے اس پہلو کی اصلاح کرتی ہے کہ تم پیدا کر دیئے جانے کے بعد ہدایت ربانی سے محروم نہیں چھوڑے گئے۔ بلکہ اس دنیا میں تمہاری زندگی کی بقاء و استحکام کا ایک ضابطہ بھی ہے جو فیضان رحمت سے ہی میسر آتا ہے کیونکہ یہی فیضان رسالت عوالم ہستی میں باری تعالیٰ کی رحمت کاملہ کی سب سے اعلیٰ و ارفع اور اکمل

صورت ہے۔ چنانچہ تعلیمات رسالت کی پیروی میں تمہاری فلاح اور ان کی خلاف ورزی میں تمہاری تباہی و بربادی ہے"۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا:-

وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ — اور رسالتمآب ﷺ کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت اور فلاح پا جاؤ۔ (الاعراف '۷:۱۵۸)

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے استدلال آخرت

سورہ فاتحہ کی تیسری آیت حیات انسانی کے تیسرے اعتقادی پہلو کی اصلاح کرتی ہے۔ وہ پہلو زندگی کے انجام سے متعلق ہے۔ جس کی اصلاح تصور معاد و آخرت کے ذریعے کی گئی ہے۔ انسان کو یہ سوچنے کی ترغیب دی گئی کہ جس ذات نے تمہیں پیدا کیا' تمہاری پرورش کی' تمہاری روح و جسم کی ضرورتوں کو پورا کیا' تمہیں ہدایت دی۔ زندگی بسر کرنے کے لیے تمہیں ضابطہ حیات عطا کیا اور تمہاری کامل رہنمائی کے لیے اپنے انبیاء و رسل بھیجے۔ یہ سب کچھ کر کے کیسے ممکن تھا کہ تمہاری زندگی کا انجام بغیر کسی نتیجہ' جواب طلبی' مواخذہ اور جزاو سزا کے ہو جاتا۔ یقیناً اسی ذات کو یہ بھی حق تھا کہ وہ تم سے تمہاری زندگی کی نسبت باز پرس کرے۔ تم نے احکام الٰہی کی اطاعت کی یا خلاف ورزی۔ تم نے زندگی صحیح طرز پر بسر کی یا غلط طرز پر' تم ایک دوسرے سے بھلائی کرتے رہے یا ظلم و زیادتی' الغرض اس مقصد کے لیے اگر کوئی باقاعدہ انتظام نہ کیا جاتا تو انسانوں کی تخلیق ان کی پرورش اور ہدایت و رہنمائی کا سارا نظام بالکل بے سود اور عبث ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے ربوبیت اور رحمت الہیہ کا تقاضا تھا کہ سلسلہ حیات انسانی کے اختتام پر کوئی یوم مواخذہ بھی ہو۔ جس میں ہر نیکوکار کو پوری پوری جزا اور ہر بدکار کو پوری پوری سزا مل کر رہے' جہاں کوئی مظلوم دادرسی کے بغیر اور کوئی ظالم اپنے انجام کے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی دن کو سورہ فاتحہ میں "یوم الدین" سے اور اس دن کی عدالت کے سربراہ کو "مالک یوم الدین" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ استدلال بھی قرآن حکیم نے کئی دیگر مقامات پر اپنایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ — کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں

اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ ○

(المومنون ۲۳: ۱۱۵، ۱۱۶)

بغیر کسی مقصد اور بے کار پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے۔ اللہ جو اس کائنات کا حقیقی مالک و حکمران ہے اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بے مقصد اور عبث کام کرے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بزرگی والے عرش کا پروردگار ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى ○ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى ○ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ○ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ○ اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰى ○

((القیامہ ۷۵: ۳۶-۴۰)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بغیر جواب طلبی کے چھوڑ دیا جائے گا (ہرگز نہیں) کیا وہ پیدائش سے پہلے گرائی ہوئی منی میں سے ایک نطفہ نہ تھا۔ پھر وہ خون کی پھٹک ہو گیا۔ پھر اللہ نے (اس سے انسان کا جسم) پیدا کیا۔ پھر اس میں درستگی پیدا کی۔ پھر اس سے دو جوڑ بنائے۔ ایک مرد اور ایک عورت (تاکہ اس طرح دنیا میں افزائش نسل انسانی کا سلسلہ قائم رہے) کیا جس نے یہ سب کچھ کیا (جواب طلبی اور مواخذہ کے لیے) مرنے کے بعد انسانوں کو نہ جلا سکے گا۔

اس آیت میں خالقیت و ربوبیت سے ثبوت آخرت پر استشہاد لایا گیا ہے اور اس دلیل کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ معاد و آخرت کے بغیر تخلیق و ربوبیت کا سارا نظام بے سود ہو کر رہ جاتا ہے۔

چنانچہ سورہ فاتحہ کا پہلا پیغام "ربوبیت الٰہیہ" کا پیغام تھا۔ یہی ربوبیت "توحید" کی دلیل تھی، یہی ربوبیت "رسالت" کی دلیل تھی اور یہی ربوبیت "آخرت" کی بھی دلیل قرار پائی۔ جس طرح ربوبیت، توحید کے بغیر کوئی مفہوم نہ رکھتی تھی، رسالت کے بغیر اس کا کوئی مفہوم نہ تھا، اسی طرح آخرت کے بغیر بھی اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ مضامین فاتحہ کا پہلا باب ہی حیات انسانی کے جملہ اعتقادات کی اصلاح کے لیے کافی و وافی ہے۔

باب-۴

سورہ فاتحہ
اور
حیات انسانی کا عملی پہلو

سورہ فاتحہ انسانی اعتقاد کی اصلاح کے بعد زندگی کے عملی پہلو کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس کی چوتھی آیت اس موضوع سے متعلق ہے:۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

جب اللہ، رب، رحمان، رحیم اور مالک، سب کچھ وہی ذات قرار پاگئی تو صاف ظاہر ہے اس کے سوا نہ کسی کی عبادت کا سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی سے استعانت کا۔ یہ اعلان متذکرہ بالا عقیدہ کے بعد اب انسانی عمل کی نوعیت اور سمت کو متعین کرنے کے لیے کیا گیا۔ یہاں دو لفظ بیان ہوئے ہیں:۔

"عبادت" اور "استعانت"۔ ان کی معنوی تفصیلات اور جزئیات تو بعد میں بیان کی جائیں گی۔ یہاں محض ان کا اجمالی مفہوم عرض کیا جاتا ہے۔

عبادت سے مراد انتہائی عاجزی، انکساری اور تذلل کا اظہار ہے۔ عاجزی اور تذلل کے مقابلے میں صاف ظاہر ہے کہ عظمت و کبریائی ہی ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے عبادت اور عبودیت دونوں لفظ بندگی اور غلامی کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ "گویا عام معنوں میں کسی کی عبادت سے مراد یہ ہو گا کہ اسے عظمت و کبریائی کا مالک تصور کرتے ہوئے اپنا آقا تسلیم کیا جائے اور خود کو اس کا عاجز و حقیر بندہ"۔ یہاں ذہن میں کسی قسم کا مغالطہ نہیں رہنا چاہیے کہ عبادت کا تصور محض نماز، روزہ اور حج و زکوۃ وغیرہ سے ہی مختص نہیں بلکہ پوری زندگی اور اس کی پوری جدوجہد پر محیط ہے۔

اگر یہ تصور دل و دماغ میں راسخ ہو جائے کہ باری تعالیٰ ہمارا آقا و مالک ہے اور ہم اس کے عاجز و نیاز مند بندے ہیں اور حق بندگی یہ ہے کہ زندگی میں جو کچھ بھی کیا جائے اپنے مالک کی مرضی کے مطابق اور اسی کی خوشنودی کی خاطر کیا جائے تو زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل عبادت قرار پاتا ہے۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور آرام کرنے سے لے کر تجارت، سفارت، سیاست و امارت اور صلح و جنگ کے میدانوں تک

ہر ایک قدم، ہر ایک سانس اور ہر حرکت و سکون عبادت ہو جاتی ہے۔ گویا سورہ فاتحہ نے یہ تعلیم دی کہ جس طرح انسان اپنے آغاز سے انجام تک ربوبیت الٰہیہ کے فیضان سے مستفید ہوتا رہتا ہے اسی طرح اسے چاہئے کہ اپنی عملی زندگی میں بھی آغاز سے انجام تک ہر لمحہ اسی کی غلامی اور بندگی میں گزار دے۔ اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی بندگی کی جاسکے۔

لہٰذا جب معبود وہی ہے تو مستعان بھی اسی کو کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ اس لیے فرمایا گیا:۔

وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور ہم مدد بھی تجھ ہی سے مانگتے ہیں۔

استعانت کا تصور انسانی زندگی کے بعض خصوصی لمحات پر حاوی ہے جبکہ عبادت کا تصور اس کی عمومی حالت پر حاوی تھا۔ کیونکہ مدد کی ضرورت انسان کو عام طور پر دو طرح کے معاملات میں ہوتی ہے۔

ایک۔ کوئی ایسی مشکل درپیش ہو کہ اپنے وسائل و ذرائع سے اس کا حل میسر نہ آسکے

اور دوسرے۔ کوئی ایسی خواہش اور آرزو ہو جس کا حصول ذاتی کوششوں سے ممکن نہ ہو۔

جب انسان کسی مصیبت اور مشکل یا کسی خواہش اور طلب کی شدت کے باعث پریشان ہوتا ہے اور اس کا مدعا اس کی ذاتی کوششوں سے حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا تو پریشانی کی یہ دونوں صورتیں اس کی زندگی میں ایک تغیر پیدا کرتی ہیں۔ اس کی سوچ میں التہابی اور ہیجانی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ یہ بے چینی اور اضطراب جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اس کے فکری اور عملی معمولات متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ فکر اور عمل کی جو کیفیت عام حالات میں ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے پریشانی کے لمحات میں نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ حالت ہے جہاں انسان شدت کے ساتھ کسی مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ جس قدر ضرورت اور حاجت شدید ہوگی۔ طلب اعانت کا داعیہ بھی اسی قدر شدید ہو گا۔ لہٰذا

وہ بندہ جس نے ساری زندگی رب العالمین کی غلامی میں گزاری تھی۔ جس نے ہمہ وقت اسی کو اپنا ملجا و ماویٰ تصور کیا تھا۔ اگر اس لمحے اپنی طلب و ضرورت کی شدت اور ہیجان انگیز جذبات کے بہاؤ میں کسی اور کے سامنے جھک گیا تو اس کی ساری بندگی رائیگاں چلی گئی اور اس کی عبودیت کی ساری پونجی لٹ گئی۔ بقول اقبال۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

یہی وقت تو بندگی اور عبودیت کی آزمائش کا تھا کہ عام حالات میں اس کی بندگی کرنے والا شدت جذبات میں بھی اسی کا بندہ رہا یا نہیں۔ بہادر شاہ ظفر کیا خوب کہتے ہیں۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ہو کتنا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

حقیقت یہ ہے کہ سورت فاتحہ کی چوتھی آیت انسانی عمل کے ان ہی دو گوشوں کی اصلاح چاہتی ہے۔

ایاک نعبد ---- کہ عام حالت میں بھی ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔

و ایاک نستعین ---- اور شدت اضطراب میں بھی ہم تیرے ہی سامنے جھکتے ہیں۔ کسی اور سے کوئی امید نہیں رکھتے۔

شدت اضطراب میں بھی اللہ ہی کے سامنے جھکنا اس ارادے کی نشاندہی کر رہا ہے کہ:۔

"اے باری تعالیٰ! ہمیں اپنی زندگی کی کوئی خواہش اور آرزو بھی تیری بندگی سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔ دیکھ! ہم نے سخت سے سخت ہیجان و اضطراب کے لمحات میں بھی تیری بارگاہ کی طرف رجوع کیا ہے۔ جب ہم اتنے اخلاص کے ساتھ تیرے بندے ہو گئے ہیں۔ تو اب تو ہمیں اپنے انعام یافتہ بندوں کے ساتھ ملا دے۔"

لہٰذا سورہ فاتحہ نے حیات انسانی کے عملی پہلو کی اصلاح اس طرح کی کہ انسان

رب کائنات کا ایسا اطاعت گزار بندہ بن جائے کہ خوشی و غمی، عیش و طیش، فراخی و تنگی، سکھ اور دکھ، صحت اور بیماری، امیری اور غریبی، آسودہ حالی اور پریشان حالی الغرض کسی حالت میں بھی اس کی بندگی ترک نہ کرنے پائے، اس کی اطاعت اور غلامی سے منہ نہ موڑے، اور اس کے بجائے کسی بڑے سے بڑے فرعون کے سامنے بھی نہ سرنیاز خم کرے اور نہ دست سوال دراز کرے۔

بیشک ایسے ہی بندگان خدا کے لیے دنیا و آخرت کی سب عزتیں ہیں۔ قرآن حکیم اسی تصور کو یوں بیان کرتا ہے:-

وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ ------ الاية

(آل عمران، ۳: ۱۳۳، ۱۳۴)

(اور وہ جنت) جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آ جاتے ہیں جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر نیکی کی تعریف کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ط اُوْلٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَ اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

(البقرہ، ۲: ۱۷۷)

اور سختی (تنگدستی) میں اور مصیبت (بیماری) میں اور جنگ کی شدت (جہاد) کے وقت صبر کرنے والے ہوں یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔

چنانچہ سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت نے عبادت اور استعانت میں اخلاص کی تعلیم کے ذریعے حیات انسانی کے عملی پہلو کی بھی اصلاح کر دی۔

باب-۵

سورہ فاتحہ
اور
تصورِ ہدایت

جب انسان دنیوی مشاغل سے بے نیاز ہو کر بارگہ ایزدی میں حاضر ہوتا ہے اور حالت نماز میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے تو ذات حق کی حمد و ثنا اور اس سے نیاز مندانہ تعلق کے بیان کے بعد فطرت انسانی کی گہرائیوں سے آواز اٹھتی ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اے رب! ہمیں سیدھی راہ چلا۔

صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی راہ منزل کے بغیر اپنی جگہ کسی اہمیت کی حامل نہیں ہوا کرتی۔ راہ کی حیثیت صرف منزل کے حوالے سے ہی متعین ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی نظر میں کسی منزل کو اپنے مقصد اور نصب العین کے طور پر متعین کرتا ہے۔ پھر اس کے دل میں منزل تک پہنچنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے جب وہ آرزو شدت اختیار کرتی ہے اور حصول مقصد کا شوق بے چین کرنے لگتا ہے تو وہ شخص اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور عازم سفر ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے معینہ منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح راستے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سیدھی راہ کو جانے بغیر وہ صحیح سمت میں اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا۔ جب بھی کوئی مسافر کسی سے صحیح راستہ دریافت کرتا ہے تو اس کا راستہ دریافت کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی منزل اس کے سامنے ضرور موجود ہے جس تک پہنچنا اس مسافر کا مطمح نظر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ منزل اور نصب العین کے شعور کے بغیر کوئی شخص راستہ پوچھتا پھرے۔ راستے کی تلاش ہمیشہ مقصدیت پر دلالت کرتی ہے۔ سورہ فاتحہ کی یہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ سے "صحیح راستہ" دکھانے کی استدعا کی گئی ہے۔ حیات انسانی کی مقصدیت کی واضح نشاندہی کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے باری تعالیٰ! ہمیں وہ راہ دکھا دے جس پر چل کر ہم اپنی زندگی کے مقصد اور نصب العین کو پا سکیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ کیا مقصد اور منزل کے تعین کے بغیر کوئی صاحب عقل سلیم صراط مستقیم یعنی سیدھی راہ کی طلب کر سکتا ہے؟ اگر منزل کا شعور اور اس کا تعین اچھی طرح واضح نہیں ہو گا تو سوال کرنے والے کے ذہن میں خود یہ الجھاؤ پیدا ہو جائے گا کہ کونسی سیدھی راہ؟ کس مقصد کے لئے؟ اور

[illegible] اپنے [illegible] کو ایک [illegible] جائے [illegible] کسی غیر واضح اور مبہم بات کرنے سے پاک ہے لہٰذا **اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ** کے الفاظ سب سے پہلے بارگاہ الوہیت میں انسان کے ضمیر سے یہ ندا بلند کرواتے ہیں۔ اے رب العلمین! ہمیں بتا دے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہمارا وہ نصب العین اور منزل حیات کیا ہے جس کے حصول کے لئے ہم زندہ ہیں اور ہمیں تگ و دو کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ جب مقصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اور منزل حیات معین ہو کر سامنے آ جاتی ہے تو انسان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکار اٹھتی ہے۔ اے ہدایت عطا کرنے والے! اب ہمیں اس مقصد کے حصول کی سبیل اور اس منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بھی دکھا دے لیکن ہدایت کا مقصد ان ہی دو تقاضوں سے پورا نہیں ہو جاتا کیونکہ منزل بتا دی جائے اور سیدھی راہ بھی دکھا دی جائے تو کیا اس سے منزل مقصود تک پہنچ جانے کی یقینی ضمانت بھی میسر آ جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ کارگہ حیات کا یہ پر پیچ سفر بڑا پر خطر بھی ہے۔ کئی قوتیں انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے پر لگی ہوئی ہیں۔ طاغوتی کاوشیں اس سیدھی راہ میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ شیطان کا سب سے بڑا حملہ بھی صراط مستقیم پر ہی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید خود شاہد ہے۔ ابلیس نے بارگاہ الوہیت میں قسم کھا کر کہا:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ

(الاعراف، ۷:۱۶)

(مجھے قسم ہے کہ) میں (بھی) ان (افراد بنی آدم کو گمراہ کرنے) کے لئے تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا۔

اس لئے عین ممکن ہے کہ کوئی شخص منزل اور صحیح راستے کی خبر پا کر سفر پر نکلے لیکن راستے میں جائے اور باوجود پوری تگ و دو کے منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ بدیں وجہ انسان کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے سیدھی راہ کی ہدایت کے علاوہ منزل مقصود تک خیر و عافیت سے پہنچ جانے کی ضمانت بھی مہیا کی جائے تاکہ راستے میں لٹے بغیر امن و اطمینان کے ساتھ وہ اپنی منزل کو پا سکے۔ یہ انسانی ضمیر کی تیسری آواز ہے جو

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے روپ میں اس کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔

ہدایت کے مدارج ثلاثہ

مذکورہ بالا یہی تین تقاضے ہدایت کے مدارج ثلاثہ کہلاتے ہیں جنہیں اصطلاحی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ **عرفان الغایہ** (مقصد اور نصب العین کا شعور و معرفت)

۲۔ **ارائۃ الطریق** (صحیح راستہ دکھانا جس کے ذریعے منزل تک پہنچنا ممکن ہو)

۳۔ **ایصال الی المطلوب** (منزل مقصود تک پہنچا دینا تاکہ گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے)

ان کی تفصیل "لفظ قرآن کے دوسرے مادہ **اشتقاق**" کے ضمن میں ہدایت کے قرآنی مفہوم کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سلسلے میں "مقدمہ" ملاحظہ فرمائیں۔ سورہ فاتحہ کی زیر مطالعہ آیت ان ہی تین تقاضوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

گویا یہ آیت حیات انسانی کے مقصد اور نصب العین کے شعور سے لے کر اس کے حصول کی حتمی ضمانت تک راہنمائی کر رہی ہے۔ ان تین مدارج کو سامنے رکھتے ہوئے آیت کے الفاظ پر دوبارہ غور فرمائیں تو حقیقت حال منکشف ہو جائے گی۔ یہ آیت بھی تین ہی حصوں پر مشتمل ہے۔ **اھدنا' الصراط' المستقیم**

اِهْدِنَا

اِهْدِنَا کی پکار کے ذریعے انسان بارگاہ ایزدی سے "شعوری ہدایت" طلب کرتا ہے۔ وہ اپنے خالق و مالک سے ایسا شعور مانگتا ہے جس کے باعث اسے اپنی منزل کی خبر ہو سکے گویا وہ زبان سے اس امر کا اعتراف کر رہا ہے کہ اے شعور عطا کرنے والے! میں بے خبری' جہالت اور ظلمت و تاریکی کے راستوں میں بھٹک رہا ہوں۔ میں اپنی منزل حیات سے بے خبر ہوں۔ مجھے اپنے مقصد تخلیق کا کوئی علم نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ مجھے وہ ہدایت اور معرفت عطا کر دے جس سے میں اپنی زندگی کے نصب

اتعین کو جان سکوں۔ مجھے اپنی منزل حیات کا شعور اور اس کا تعین عطا کر دے۔ مجھے اپنی غایت تخلیق اور مقصد زیست سے آگاہ کر دے۔ صدق دل سے نکلنے والی اس پکار پر ہدایت حق متوجہ ہوتی ہے اور انسان کو "شعور مقصد" عطا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد ایک نئی طلب جنم لیتی ہے اور وہ ہے راستے کے تعین کی ضرورت۔

الصِّرَاط

الصراط کی پکار کے ذریعے انسان بارگاہ ایزدی سے "راستے کے تعین کی ہدایت" طلب کرتا ہے۔ اب وہ خالق و مالک سے ایسی راہنمائی مانگتا ہے جس کے باعث اسے منزل تک پہنچانے والے راستے کی خبر ہو سکے۔ گویا وہ رب ذوالعطاء سے یہ التجا کر رہا ہے کہ اے راستہ دکھانے والے! مجھے معلوم نہیں کونسا راستہ اس منزل کو پانے کے لئے صحیح ہے اور کونسا غلط؟ مجھے اپنی رحمت سے سیدھی راہ کی ہدایت عطا کر دے۔ میرے لئے اس راہ کو متعین کر دے جس پر چل کر میں اپنی منزل حیات کو پا سکوں۔ صدق دل سے اٹھنے والی اس پکار پر ہدایت حق متوجہ ہوتی ہے اور انسان کو صحیح راستے کے تعین کی توفیق سے نواز دیتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور طلب دامن گیر ہو جاتی ہے اور وہ ہے حصول مقصد کی ضمانت۔

الْمُسْتَقِيْم

الْمُسْتَقِيْم کی پکار کے ذریعے انسان بارگاہ ایزدی سے "استقامت اور حصول مقصد کی ضمانت" طلب کرتا ہے۔ اب وہ اپنے خالق و مالک سے اس امر کی یقین دہانی مانگتا ہے کہ وہ صحیح راستے پر استقامت کے ساتھ گامزن رہ سکے کیونکہ استقامت ہی منزل مقصود تک پہنچنے کی اصل ضمانت ہے۔ گویا وہ یہ دعا کر رہا ہے کہ اے کامیابی عطا کرنے والے! مجھے دولت استقامت سے نواز دے تاکہ میں بالیقین اپنی منزل کو پا سکوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں صحیح راہ پر چلتے چلتے بھٹک جاؤں اور پھر منزل کا سراغ نہ مل سکے اس لئے مجھے وہ راہ بتا دے جو محفوظ و مامون ہو، جس پر راہزن مسافروں کو نہ لوٹ

سکیں، جس پر شیطان تیرے بندوں کو بہکا نہ سکے اور جس پر چلنے سے ایسی استقامت نصیب ہو کہ مقصد حاصل ہو کر رہے۔ جب یہ ندا دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے تو ہدایت حق متوجہ ہو کر انسان کو حفاظت اور استقامت کا مژدہ جانفزا سنا دیتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

"اگر حفاظت و استقامت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچنے کی ضمانت چاہتے ہو تو آؤ میرے انعام یافتہ بندوں کے ہم سفر بن جاؤ۔ ان کی معیت و رفاقت اختیار کر لو کیونکہ ان پر نہ کبھی میرا غضب ہوا ہے اور نہ وہ کبھی راہ ہدایت سے بھٹکے ہیں۔"

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

(الفاتحہ، ۱:۶-۷)

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ ہی گمراہوں کا۔

اس لئے جو طالب ہدایت ان مقبولان خدا کا ہم سفر ہو جائے گا وہ اپنے مقصد حیات میں کامیاب و کامران ہو گا۔ اسے منزل مقصود مل کر رہے گی، اسے راستے میں کوئی بہکا نہ سکے گا کیونکہ شیطان خود ان لفظوں میں اپنی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف کر چکا ہے:

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

(الحجر، ۱۵:۳۹-۴۰)

ان سب کو ضرور گمراہ کر کے رہوں گا سوائے تیرے ان برگزیدہ بندوں کے جو (میرے اور نفس کے فریبوں سے) خلاصی پا چکے ہوں۔

لہٰذا سورہ فاتحہ نے حیات انسانی کی مقصدیت کو اتنے جامع انداز سے بیان کیا کہ نصب العین کے تعین سے لے کر حفاظت و استقامت کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دینے کی ضمانت تک مہیا کر دی۔

لفظ صراط استعمال کرنے کی حکمت

یہاں یہ سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ہدایت کا آغاز تو شعور مقصد سے

[illegible]
نہیں رہتا لیکن اس آیت میں صراط یعنی راستے کی ہدایت کو نمایاں انداز میں بیان کیا گیا ہے حالانکہ یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اس کی بجائے مقصد کے شعور اور نصب العین کی ہدایت کو اس قدر واضح انداز میں کیوں نہیں بیان کیا گیا جو کہ ہدایت کا پہلا مرحلہ اور طلب کا تقاضائے اولین تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جس چیز کی ضرورت انسان کو سب سے پہلے تھی اسی کی ہدایت کو نمایاں انداز سے طلب کیا جاتا لیکن یہاں دوسری ضرورت یعنی راستے کے تعین کو زیادہ واضح کیا گیا اور پہلی ضرورت یعنی منزل کے شعور اور تعین کو قدرے مخفی رکھا گیا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے منزل اور مقصد حیات کی رہنمائی طلب کرے تو اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین کو جاننے اور مقصد زیست کو پہچاننے کا آرزومند ہے لیکن صرف یہ طلب اس امر کی دلالت نہیں کرتی کہ وہ اس منزل تک پہنچنے اور اس مقصد کو پانے کے لئے جدوجہد پر بھی سنجیدگی کے ساتھ آمادہ ہے۔ گویا اس سوال کی حیثیت محض علمی ہوگی عملی نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی کسی سے اپنی منزل کا سیدھا راستہ دریافت کرے تو اس سے واضح طور پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ منزل تو وہ جان چکا ہے اب وہ اس تک پہنچنے کی کوشش میں سنجیدہ اور فکرمند ہے۔ گویا یہ سوال محض علمی نہیں بلکہ عملی حیثیت کا بھی حامل ہوگا۔ پہلے سوال کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ مقصد کیا ہے؟ دوسرے سوال کی نوعیت یہ ہے کہ مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے؟ پہلے سوال کا انداز یہ ہوتا ہے کہ منزل کونسی ہے؟ دوسرے سوال کا انداز یہ ہے کہ منزل تک پہنچا کس طرح جائے؟ پہلا سوال محض حقیقت کو جاننے کی غرض سے ہوتا' دوسرا سوال حقیقت کو پانے کی غرض سے ہے۔ پہلا سوال صرف ایک تصور کو معلوم کرنے کی حد تک ہوتا' دوسرا سوال اس تصور کو واقعہ بنانے کی خاطر ہے۔ پہلے سوال کا موضوع علم تھا دوسرے سوال کا موضوع عمل ہے۔

علم کی ابتداء شک سے ہوتی ہے' عمل کی یقین سے
علم میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے' عمل میں عزم و ارادے کو
علم کا تعلق توجیہہ سے ہے اور عمل کا تخلیق سے

توجیہہ صرف تین چیزوں سے بحث کرتی ہے

۱۔ **تجزیہ و تحلیل**، کسی شئے کے اجزائے ترکیبی کو معلوم کرنا۔

۲۔ **تنظیم**، اس شئے کی ماہیت اور ہیئت کذائیہ کو اس کے منظم مدلول یعنی معنی اور اطلاق کی صورت میں جاننا۔

۳۔ **تعلیل**، اس شئے کی علت اور مقصد کو دریافت کرنا۔

لیکن **تخلیق** تجربی توثیق سے منتزع ہونے والے مشاہداتی اور معروضی نتائج سے بحث کرتی ہے۔ گویا پہلے سوال کے ذریعے مطلوبہ حقیقت کو جان کر زیادہ سے زیادہ اس کی توجیہہ تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی جبکہ دوسرے سوال کے ذریعے مطلوبہ حقیقت کو پا کر اس سے حاصل ہونے والے فوائد و ثمرات سے بھی متمتع ہوا جا سکتا ہے۔

اس لئے اگر سورہ فاتحہ کی یہ آیت "مقصد" دریافت کرنے کی التجا پر مشتمل ہوتی تو اس سے **علم** کی ضمانت تو میسر آتی **عمل** کی نہیں۔ قرآن حکیم نے راستہ اور طریق کار دریافت کرنے کی التجا کا ذکر کر کے انسانوں کو اس طرف متوجہ کر دیا کہ:

☆ اسلام محض فکر کا نہیں، عزم و ارادے کا نام ہے۔

☆ اسلام محض علم کا نہیں، عمل کا نام ہے۔

☆ اسلام محض تبلیغ کا نہیں، تعمیل کا نام ہے۔

☆ اسلام محض توجیہہ کا نہیں، تخلیق کا نام ہے۔

☆ اسلام محض مقصود حیات کو جاننے کا نہیں، اس کو پانے کا نام ہے۔ اور

☆ اسلام محض فلسفیانہ موشگافیوں کا نہیں بلکہ عملی جد و جہد کے ذریعے نتائج پیدا کرنے کا نام ہے۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

یہی وہ نکتہ ہے جہاں قرآنی علم اپنی ماہیت، مقصدیت اور افادیت کے اعتبار

سے دیگر علمی اور فلسفیانہ نظریات سے ممتاز نظر آتا ہے۔ قرآنی علم و ہدایت کی اسی مخصوص جہت اور افادیت و مقصدیت کو اجاگر کرنے کے لئے سورہ فاتحہ میں لفظ **صراط** استعمال کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآن بندوں کو محض نظری و فکری ہدایت کا طالب ہی نہیں بلکہ عملی ہدایت کا طالب بنانا چاہتا ہے اور انسانوں کو مقصد حیات کی معرفت کے بعد اس کو حاصل کرنے کی فیصلہ کن جدوجہد میں گامزن کرنا چاہتا ہے۔

قرآنی علم اور دیگر علمی نظریات میں امتیاز

قرآنی علم اور دیگر فلسفیانہ نظریات میں کئی اعتبارات سے امتیاز موجود ہے جن کو بعد میں کسی مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت چونکہ ہمارے پیش نظر صرف ''مقصدیت'' کا پہلو ہے اس لئے یہاں صرف اسی اعتبار سے مذکورہ فرق کو بیان کیا جاتا ہے۔ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** کے اسلوب کی متذکرہ بالا توضیح اور لفظ ''صراط'' کے استعمال کی حکمت کے بیان سے یہ حقیقت تو اچھی طرح ذہن نشین ہو چکی ہو گی کہ قرآنی علم کا مقصد شعبہ ہائے حیات میں اس کے نصب العین اور منزل مقصود سے صرف آگاہ کر دینا ہی نہیں بلکہ اس کے حصول کی ایسی عملی صورت بھی واضح کر دینا ہے جس میں مفروضی نتائج کے میسر آنے کی حتمی و قطعی ضمانت ہو۔ اب ہم اس لحاظ سے دیگر علمی نظریات کے ساتھ قرآنی علم کا مختصر سا موازنہ پیش کرتے ہیں۔

اخلاقیات

اخلاقیات میں تمام علمی اور فلسفیانہ نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ اخلاق کی ماہیت کیا ہے؟ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ معیار اخلاق کیا ہے؟ معیار اخلاق کی صحت پر منطقی اساس کیا ہے؟ اور اس کے کمال کے متضمنات کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علم** ان تمام سوالات کا حتمی جواب دینے کے بعد اس امر سے بحث کرتا ہے کہ مطلوبہ معیار اخلاق کے مطابق انسان کی عملی زندگی کس طرح ڈھلے گی؟ اور فضائل اخلاق حیات انسانی میں واقعہ بن کر کس طرح تبدیلی پیدا کریں گے؟ اس مسئلے پر قرآن و سنت کے سوا دنیا کے تمام فلسفے خاموش ہیں۔

عمرانیات

عمرانیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ معاشرہ کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آتا ہے؟ اور اس کے انضباط و اختلال کے اسباب کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علم** ان مسائل سے آگے بڑھتے ہوئے اس امر سے بحث کرتا ہے کہ معاشرے میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے اختلال کو رفع کر کے ہیئت عمرانی کو ایک ایسی موثر وحدت میں کس طرح بدلا جا سکتا ہے جو افتراق و انتشار کے تمام رجحانات پر قابو پالے؟

سیاسیات

سیاسیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ ریاست کیا ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کے اجزاء کی ماہیت اور ان کا وظیفہ و عمل کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علم** ان مسائل سے آگے بڑھتے ہوئے اس امر سے بحث کرتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان پیدا ہونے والے سیاسی تناقض کو رفع کر کے اس قومی نصب العین کو کس طرح حاصل کیا جائے جس کے نتیجے میں پورا معاشرہ ہر قسم کے اندرونی و بیرونی موجبات خوف و غم سے محفوظ ہو جائے؟

معاشیات

معاشیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ معاشی تخلیق کا عمل کیا ہے؟ دولت کی تقسیم اور اس کے صرف کا عمل کس طرح واقع ہوتا ہے؟ اور دولت اور محنت کا باہمی توازن کیا ہے؟

لیکن **قرآنی علم** مسئلے کی اس جہت پر بحث کرتا ہے کہ معاشی تخلیق کو مزعومہ مفادات سے پاک کر کے اور وسائل دولت پر سے محدود گروہوں کی اجارہ داری ختم کر کے تقسیم دولت کے ایسے منصفانہ نظام کو کس طرح رائج کیا جائے کہ کسی فرد کی تخلیقی جد و جہد میں معاشی تعطل باقی نہ رہے اور فرد و معاشرہ دونوں کسی سطح پر بھی

حاجت مندی کا شکار نہ ہونے پائیں؟

مذہبیات

مذہبیات میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ عقیدہ کیا ہے؟ اعمال صالحہ کیا ہیں؟ پسندیدہ اور ناپسندیدہ عقائد و اعمال میں کیا فرق ہے؟ اور ہر دو کے نتائج و اثرات کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علم** ان مسائل کا حتمی جواب مہیا کرنے کے بعد اس امر سے بحث کرتا ہے کہ اگر عقائد' اوہام میں اور اعمال' مردہ رسوم میں بدل چکے ہوں اور ان کے درمیان کوئی موثر تعلق باقی نہ رہا ہو تو انہیں پھر کس طرح سے زندہ کیا جائے کہ عقیدہ و عمل کا تعلق بحال ہو کر انسانوں کی سماجی زندگی میں مطلوبہ انقلاب بپا کر سکے؟

متذکرہ بالا موازنہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ تمام علمی اور فلسفیانہ نظریات میں شروع سے آج تک سوچ کا رخ یہی رہا ہے کہ مسئلے کی نوعیت کیا ہے؟ لیکن قرآنی علم مسئلے کی نوعیت متعین کرنے کے بعد ہمیشہ سوچ کو یہ رخ عطا کرتا ہے کہ مسئلے کا حل کس طرح میسر آئے۔ قرآن صرف حقیقت کی ماہیت سے نہیں بلکہ اس تک رسائی کے طریق کار سے بحث کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب سورہ فاتحہ کے ذریعے بنی نوع انسان کو زندگی کے مقصد سے آشنا کرایا گیا تو بجائے اس کے کہ انسان کی زبان پر یہ سوال وارد کیا جاتا کہ "ہماری زندگی کا مقصد اور نصب العین کیا ہے؟" انسان کو سراپا سوال بنا کر بارگاہ ایزدی میں کھڑا کر دیا گیا اور اسے یہ سوال کرنے کی تلقین کی گئی کہ ہماری زندگی کے نصب العین تک پہنچنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟" لہٰذا یہ آیت سوال کے ذریعے انسان کو محض مسئلے کی نوعیت کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے حل کے بارے میں ہدایت طلب کرنے کی تلقین کر رہی ہے کیونکہ فکری ہدایت' عملی ہدایت کے بغیر بے سود اور ناکافی ہے۔

قرآنی ہدایت اور مقصد تخلیق

مذکورہ بالا وضاحت کی روشنی میں اب ہم قرآنی ہدایت کے ذریعے انسانی

زندگی کا وہ نصب العین تلاش کرتے ہیں جس کی خاطر انسان کو پیدا کیا گیا اور جس کے لئے اسے اپنے عرصہ حیات میں جدوجہد کرنے کا حکم صادر کیا گیا ہے۔ قرآن اپنی نسبت سراسر ہدایت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ

(یہ قرآن) لوگوں کے لئے واضح بیان ہے اور ہدایت ہے اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت ہے۔

(آل عمران '۳:۱۳۸)

اس لئے اس مقدس کتاب کا کام ہی یہ ہے کہ انسانیت کو ظلمتوں اور گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر رشد و ہدایت کے اجالے سے ہمکنار کر دے جیسا کہ خود ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(الف لام را' یہ عظیم) کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کو (کفر) کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کے) نور کی جانب لے آئیں۔

(ابراہیم '۱۴:۱)

منزل حیات اور نصب العین سے بے خبری بھی تاریکی ہے اور منزل کے صحیح راستے سے بے خبری بھی تاریکی ہے لہٰذا نسل انسانی جہاں جہاں جس جس قسم کی گمراہی اور تاریکی میں مبتلا تھی قرآن نے اسے اسی قسم کی ہدایت سے سرفراز کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ

بے شک یہ قرآن اس (منزل) کی راہنمائی کرتا ہے جو سب سے درست ہے۔

(الاسراء '۱۷:۹)

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ انسانی زندگی کے تین درجے ہیں۔

"انفرادی" "قومی" اور "بین الاقوامی"

چنانچہ ہمیں حیات انسانی کی ہر سطح اور ہر درجہ پر مقصد اور نصب العین بھی

[illegible]
ہو گا۔ پس یہی وہ مدعا ہے جو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے ذریعے ہم ہر نماز کے دوران بارگہ ایزدی میں دست بستہ پیش کرتے ہیں۔ اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کائنات ہستی اور اس کا ایک ایک وجود بلاشک و شبہ بامقصد تخلیق کیا گیا ہے۔ موجودات عالم کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جس کی خلق عبث اور بے مقصد ہو۔ خود قرآن حکیم اس حقیقت کی شہادت یوں مہیا کرتا ہے۔

وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا
(آل عمران، ۳:۱۹۱)

اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حسن کے جلووں) میں فکر کرتے رہتے ہیں (پھر اس کی معرفت سے لذت آشنا ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔

یہاں بامقصد تخلیق کا یہ اعتراف تو انسانوں کی زبان سے کروایا گیا۔ اب اس طرح باری تعالیٰ خود اعلان فرماتے ہیں۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○
(الدخان، ۴۴:۳۸-۳۹)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہ بنایا۔ ہم نے تو انہیں نہ بنایا مگر حق کے ساتھ، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

جب کائنات ارض و سما کا ہر وجود کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے بلکہ بلامقصد تخلیق کرنا خود شان الوہیت کے ہی منافی ہے تو یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے پیدا کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا ہو گا۔ یہ امر ناقابل اعتبار ہے اور یقیناً قرآن بھی حیات انسانی کو بے مقصد قرار نہیں دیتا۔ موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے قرآن واضح کرتا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ○ (الملک ۶۷: ۲)	وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہتر جدوجہد کون کرتا ہے اور وہی عزت والا، بخشنے والا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ عملی جدوجہد کے لئے کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین درکار ہوتا ہے جس کے حصول کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس کی مطابقت یا عدم مطابقت کے لحاظ سے جدوجہد کرنے والوں کے اعمال کا مقام متعین ہوتا ہے کہ آیا یہ شخص کامیاب رہا یا ناکام، اس نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا یا نہیں۔ قرآن کے مطابق زندگی مقصد کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے اور موت اس کے اخروی انجام و نتائج سے۔ اس لئے انسانی زندگی کا بامقصد ہونا خود نظام کائنات کے جواز کی بنیادی دلیل ہے۔

باب-٦

اسلوب سورت
اور
نظام فکر و عمل

سورت فاتحہ اپنے مضامین کے اعتبار سے اس لیے بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے اس میں ایسا بھرپور نظام فکر و عمل بیان کیا گیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر زندگی کی تمام مشکلات اور رکاوٹوں کو عبور کیا جا سکتا ہے۔ فکر و عمل کا یہ نظام آٹھ ضابطوں پر مشتمل ہے۔ اس قرآنی ہدایت کی صحیح معرفت کے بعد دنیا کے کسی اور مفکر کے افکار و نظریات کی دریوزہ گری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس قرآنی نظام فکر و عمل کے آٹھ ضابطے درج ذیل ہیں۔

۱۔ صحت عقیدہ (اخلاص فی الایمان)

۲۔ صحت عمل (اخلاص فی العمل)

۳۔ فکر احتساب و مسئولیت

۴۔ منزل مقصود کا صحیح تعین

۵۔ جدوجہد میں استقامت و استقلال

۶۔ حصول مقصد میں کامیابی کا پختہ یقین

۷۔ اہل حق کی پہچان اور ان کی مصاحبت و معاونت

۸۔ اہل باطل کی پہچان اور ان سے خصومت و عدم معاونت

صحت عقیدہ

قرآنی نظام فکر و عمل کی اساس اور نقطہ آغاز عقیدے کی اصلاح ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر عمل جو اختیاری و ارادی ہو گا۔ اس کا آغاز کسی نہ کسی فکر اور تصور سے ہی ہوتا ہے۔ وہی فکر اور تصور عام طور پر عمل کی سمت بھی متعین کرتا ہے اور اس کی نوعیت و حیثیت بھی۔ اس فکر اور تصور کو جو درحقیقت عمل کا صورت گر ہے "عقیدہ" کہا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو عمل شرف قبولیت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اگر

عقیدہ غلط اور فاسد ہو تو عمل بھی پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتا ہے۔ لہذا عمل کی قبولیت یا عدم قبولیت یا اس کا صالح اور فاسد ہونا صحت عقیدہ یا فساد عقیدہ پر منحصر ہے۔ چونکہ ہر عمل اور جدوجہد کی بنیاد عقیدہ ہے۔ اس لیے سورت فاتحہ نے نظام فکر و عمل کے بیان کا آغاز بھی "اصلاح عقیدہ" سے کیا ہے۔ اسلامی اعتقاد کی عمارت فی الواقع تین بنیادی ستونوں پر قائم کی گئی ہے۔

توحید، رسالت، آخرت

سورہ فاتحہ کے حوالے سے ان کی وضاحت "مضمون سورت اور حیات انسانی کے اعتقادی پہلو" کے عنوان کے تحت ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں مضامین فاتحہ کا پہلا باب ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں محض اشارے کے لیے عرض کیا جاتا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تمام تعریفوں کا مستحق صرف اللہ ہے جو رب کائنات ہے۔

پہلی آیت عقیدہ توحید کے بیان پر مشتمل ہے۔ جس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ تمام خوبیوں اور کمالات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی لیے تمام تعریفوں کا حقیقی مستحق بھی وہی ہے۔ وہ ذات الوہیت تمام کائنات کی پروردگار بھی ہے۔ یعنی ہر شے کی پیدائش سے لے کر اسے منتہائے کمال تک پہنچانے والا وہی ہے اور اس اثناء میں تمام ضرورتوں اور حاجتوں کا کفیل بھی وہی ہے۔

اسی طرح "**الرحمان الرحیم**" کے الفاظ پر مشتمل دوسری آیت جو باری تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت اور یوم جزا کی مالکیت کے ذکر کے درمیان واقع ہے مخلوق پر اس کی بے پایاں رحمتوں اور مہربانیوں کا بیان کر رہی ہے۔ اس کی رحمتوں کے انداز اور رنگ نرالے اور عجیب سے عجیب تر ہیں۔ لیکن اس کی تمام رحمتوں سے ارفع رحمت اور تمام مہربانیوں سے اعلیٰ مہربانی مخلوق خدا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے انبیاء و رسل کا مبعوث کرنا ہے اور ان سب سے بڑھ کر کائنات عالم پر خدا کی عظیم رحمت حضرت محمد

مصطفےٰ ﷺ کی نبوت و رسالت ہے۔ جس نے انسانوں کو خدا کی ربوبیت کی معرفت، اس کا شکر ادا کرنے اور یوم جزا میں اس کے حضور پیش ہو کر سرخرو ہونے کے انداز سکھائے ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو سراسر "رحمۃ للعالمین" قرار دیا گیا ہے۔ اس رحمت دو عالم ﷺ کے بغیر نہ کسی کو متاع ہدایت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کوئی منزل مراد تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

اِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (الشوریٰ '۴۲: ۵۲) بیشک آپ ہی سیدھے راستے کی راہنمائی فرماتے ہیں۔

عقیدہ توحید و رسالت کے بعد یوم آخرت کے انعقاد پر ایمان رکھنا انتہائی ناگزیر ہے۔ انسان کے دل و دماغ پر ہمہ وقت یہ تصور محیط رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جن نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا ہے۔ ان کا معاملہ بغیر کسی حساب و کتاب کے انجام پذیر نہیں ہو گا۔ بلکہ قیامت کے دن ہر شے کا حساب ہونا ہے۔ خدا کی نعمتوں کا شکر بجالایا گیا یا نہیں' خدا کے احکام کی اطاعت کی گئی یا نہیں۔ خدا کے نواہی سے انسان رکا رہا یا نہیں' الغرض ہر ہر حکم اور ہر ہر نعمت کا حساب ہو گا تاکہ اطاعت گزار مزید نعمتوں کا اور معصیت کیش سزا و عتاب کا حصہ پا سکیں۔

گویا سورہ فاتحہ عقیدہ و ایمان کی اصلاح و اخلاص کی تعلیم دیتے ہوئے انسان کو یہ فکر عطا کرنا چاہتی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنا خالق و مالک اور پروردگار صرف اور صرف رب ذوالجلال کو سمجھے اور تمام کمالات و محاسن کا اصل منبع و سرچشمہ بھی اسی کو تصور کرے۔ نہ دنیا کی کسی اور طاقت سے امید رحمت وابستہ کرے نہ کسی سے خوف عذاب رکھے اور نہ ہی کسی اور پر توکل کرے' انسان صرف اسی کا بندہ ہے اور ہر وقت اس کی غلامی اور بندگی میں لگا رہے۔ اسی طرح رب کائنات کی تمام رحمتوں اور نعمتوں کا واسطہ' اس کی ذات تک رسائی اور معرفت کا ذریعہ اور اس کی رضا و خوشنودی کے حصول کا راستہ رسالت محمدی ﷺ کو ہی تصور کرے۔ حضور ﷺ کی نسبت کے بغیر نہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ' عقیدہ توحید بن سکتا ہے اور نہ جزا و سزا کا عقیدہ' عقیدہ

آخرت۔

انسان یہ سمجھے کہ تمام عقائد و اعمال کی صحت کی حتمی ضمانت صرف ذریعہ رسالت سے مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر بارگاہ ایزدی میں کچھ بھی قبول نہیں۔ مزید برآں انسان کے عقیدے میں "ایمان بالآخرہ" جزو لاینفک کے طور پر شامل ہو کہ انبیاء و رسل کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے یا ان کی خلاف ورزی کرنے کا نتیجہ اس دنیا کی کامیابی یا ذلت و رسوائی کے علاوہ ایک مقررہ دن کو بھی علی الاعلان مل کر رہے گا۔ جس دن نہ کوئی ظالم اپنے انجام کو پہنچے بغیر رہے گا اور نہ کوئی مظلوم دادرسی کے بغیر اس عقیدے کا بیان "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے الفاظ میں موجود ہے۔

صحت عمل

عقیدے کی اصلاح کر لینے کے بعد عمل کی اصلاح اور اخلاص کا ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل بھی "مضمون سورت اور حیات انسانی کے عملی پہلو" کے عنوان کے تحت مضامین فاتحہ کے دوسرے باب میں مذکور ہے:۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ — ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

اس آیت نے انسانی عمل کو دو دائروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عبادت اور استعانت زندگی کی ساری جدوجہد جو بعض امور کے سرانجام دینے اور بعض سے پرہیز کرنے سے عبارت ہوتی ہے۔ اگر خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے ہو جائے تو ساری زندگی کا عمل عبادت ہے۔ اس لیے عبادت بھی اللہ کے لیے خاص ہے اور اگر زندگی کے کسی مرحلے پر کوئی دشواری یا مشکل پیش آجائے تو انسان مدد بھی فی الحقیقت اللہ ہی سے چاہتا ہے اس لیے استعانت بھی اللہ کے لیے خاص ہے۔ ہر عمل خواہ عبادت ہو یا استعانت' اس کا صحیح سزاوار رب کائنات ہے۔ چنانچہ انسان کو چاہئے کہ اس کے سوا نہ کسی اور کی بندگی اختیار نہ کرے اور نہ کسی اور کے سامنے دامن امید دراز کرے۔ کیونکہ جب

معبود وہی ہے تو جو استعانت شان معبودیت کے لائق ہو۔ اس کا حقدار بھی یقیناً وہی ہو گا۔ اس تصور کو ذہن میں راسخ کر لیا جائے تو نتیجتاً اخلاص فی العمل کی دولت میسر آجاتی ہے:

فکر احتساب و مسئولیت

جب انسان اپنے عقیدہ و ایمان کی اصلاح کر کے اپنے ہر عمل اور تمام عمر کی جدوجہد کو محض رضائے الٰہی کے لیے خاص کر دیتا ہے تو اس کی زندگی کی حرکت صحیح سمت میں شروع ہو جاتی ہے۔ اب اس جدوجہد کو صحیح سمت میں قائم رکھنے اور اسے نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دل و دماغ میں احتساب اور جوابدہی کا تصور جاگزیں ہو جائے۔ اسے یہ معلوم ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ مجھے اس کے لیے جواب دینا ہے اور اس کے نتائج سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے۔ احتساب و مسئولیت کا ایک مقام جو دار آخرت ہے تو سب کو معلوم ہے لیکن قدرت کے احتساب' جواب طلبی' مواخذہ اور جزا و سزا کا ایک نظام اس دنیا میں بھی موجود ہے۔ جس سے ہر شخص کو صبح و شام پالا پڑتا ہے۔ اگر نفس کی غفلت یا کسی مفاد کی خاطر انسان اس روشن حقیقت سے صرف نظر کر لے تو یہ اس کی بدبختی ہے۔ ورنہ احتساب و مواخذہ کا یہ کائناتی قانون اپنے اندر انسان کی اصلاح کی ضمانت رکھتا ہے۔ اس کے ادراک سے انسان کی چشم عبرت پذیر وا ہوتی ہے۔ وہ اپنی اصلاح و تطہیر کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔ دوسروں کی تنقید کو خوش آمدید کہتا ہے اور اس سے بہرطور کوئی نہ کوئی نصیحت پکڑتا ہے۔ اگر انسان خود کو احتساب و جوابدہی اور تنقید و مواخذہ سے بالاتر سمجھے تو اسے اپنے طرز عمل پر بھی نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نتیجتاً جو خرابی اور بگاڑ اس کے عمل میں ایک مرتبہ پیدا ہو جائے۔ اس میں اضافہ تو ہو سکتا ہے۔ کمی یا خاتمے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس لیے خود کو عقل کل سمجھنے والے مفکرین و قائدین جو اپنے آپ کو عملاً احتساب و مسئولیت سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ نہ صرف انحراف کی راہ پر گامزن رہتے ہیں بلکہ

فرعونیت کا ایسا بت بن جاتے ہیں کہ دوسروں سے اپنی فکری پرستش اور عملی غلامی کے بغیر ان کی انانیت کی تسکین نہیں ہوتی۔ توحید اور قطع شرک کا درس دینے کے باوجود وہ عملی اعتبار سے سب سے بڑے "شرک پسند" واقع ہوتے ہیں۔

ان کے پیروکار ان کے فکر و عمل میں کسی قسم کی خطا، لغزش یا غلطی کے امکان کو تسلیم کرنے کے روادار نہیں ہوتے اور اس طرح وہ علی الاعلان "شرک فی النبوت" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف تو ایسے مفکرین نے جناب رسالتمآب ﷺ کی ذات اقدس سے بھی خطا یا غلطی کا صدور نہ صرف ممکن بلکہ واقع بیان کیا ہے اور ان کی ہستی کو جو مقتدائے کائنات اور مطاع مطلق ہے، لغزش کے وقوع سے (معاذاللہ) بالاتر نہیں سمجھا۔ مگر دوسری طرف ان کی اپنی تعلیمات کے اثر سے ان کے پروردہ اور تربیت یافتہ عقیدت مندوں اور پیروکاروں کی سوچ کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے مفکر اور مقتداء کو کسی لحاظ سے بھی غلطی اور لغزش کا مرتکب ماننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کو اصل "کفر" اور دین اسلام کے خلاف سازش تصور کرتے ہیں۔ گویا خود کو احتساب و مسئولیت سے بالاتر سمجھنے والے اپنی نسبت "دیں ہمہ اوست" کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اسی خامی نے بڑی بڑی صلاحیتوں کے باوجود کئی مفکرین اور قائدین کی "اصلاحی کوششوں" کو بالآخر تخریب میں بدل دیا ہے۔ چنانچہ ایسی کئی کاوشیں اسلام کی سالمیت و استحکام کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر خاص و عام اپنی جدوجہد کے دوران اپنے طرز عمل اور اس کے نتائج پر نظر ثانی کرتا رہے۔ خود تنقیدی اور تنقید یا احتساب و مسئولیت کے طریق کار پر گامزن رہتے ہوئے اپنی اصلاح و تطہیر کی طرف ہر وقت متوجہ رہے۔ یہی فکر درحقیقت اس کی صحیح عظمت اور ترقی کی ضامن بھی ہے اور آئینہ دار بھی۔ اسی سے طبیعت میں عجز و انکساری اور تواضع پیدا ہوتی ہے۔ جس سے انسانی شخصیت کو کمال نصیب ہوتا ہے "مالک یوم الدین" کے الفاظ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہر قدم پر انسان کی نظر اس دن اور اس لمحے پر رہنی چاہئے۔ جب ہر عمل اپنے انجام کو پہنچ جائے گا اور ہر شخص کو اپنے کیے پر جوابدہ ہونا ہو گا۔

منزل مقصود کا تعین

عقیدہ و عمل کی اصلاح اور احتساب و مسئولیت پر پختہ یقین کے باوجود اگر جدوجہد سے پہلے صحیح منزل متعین نہ کی گئی ہو تو ساری جدوجہد بے نتیجہ رہتی ہے۔ اس لیے زندگی کے ہر معاملے میں کوشش سے پہلے منزل مقصود کا تعین ضروری ہے۔ سفر سے پہلے منزل معلوم نہ ہو تو وہ سفر کس طرح انجام پذیر یا مطلوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے؟ آج ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ عرصہ دراز سے جدوجہد جاری ہے۔ لیکن منزل کی کوئی خبر نہیں۔ ہر رہبر کچھ دیر قوم کی رہنمائی کرتا ہے لیکن ہر بار قوم اپنے سفر حیات میں چند قدم پیچھے ہی چلی جاتی ہے۔ نظام فکر و عمل کا یہ ضابطہ "**اھدنا**" کے دعائیہ الفاظ میں مندرج ہے۔ سورت فاتحہ کی اس آیت کے ذریعے انسانوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب سے "ہدایت" یعنی منزل مقصود کی رہنمائی طلب کریں۔ اس کے بغیر وہ صحیح سمت میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ جیسا کہ "مضمون سورت اور حیات انسانی کی مقصدیت" کے باب میں درج ہے کہ ہدایت کا سب سے پہلا درجہ ہی "منزل مقصود کا صحیح تعین" ہے کیونکہ اس کے بغیر رہنمائی کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

جدوجہد میں استقامت

منزل مقصود کے صحیح تعین کے بعد اس کے حصول کی جدوجہد میں استقامت نہایت ضروری ہے۔ اگر انسان راہ حق میں آنے والے مصائب و آلام سے گھبرا کر حوصلہ ہار دے تو کامیابی کبھی بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ کامیابی کا اصل راز استقامت و استقلال میں ہی مضمر ہے۔ سورہ فاتحہ میں جہاں منزل مراد کی رہنمائی کا ذکر ہے۔ وہاں راستے میں استقامت و استقلال کی دعا کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

اھدنا ------ میں منزل مقصود کا تعین درکار ہے۔

الصراط ------ میں اس کی سمت جانے والے راستے کی نشاندہی مطلوب

ہے اور

المستقیم ----- میں راستے کی استقامت اور منزل مقصود کی طرف جانے والے راستے کی صحت و صداقت کی ضمانت مطلوب ہے۔ گویا انسان باری تعالیٰ سے نہ صرف ہدایت طلب کرے بلکہ راہ ہدایت میں پختگی اور ثابت قدمی کی دعا بھی کرے۔ کیونکہ راہ ہدایت یقیناً دشوار گزار ہوتی ہے۔ جس میں قدم قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس لیے ہدایت کے ساتھ استقامت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کلمہ حق بلند کرے اور باطل کے ایوانوں میں زلزلہ برپا نہ ہو۔ حق جس قدر واضح ہو گا باطل کی مخالفت اتنی ہی شدید ہو گی۔ اگر کوئی نعرہ بلند ہو اور مفاد پرست باطل قوتوں کے مفادات کو خطرہ لاحق نہ ہو اور نہ وہ اس نعرے کی مخالفت میں آمادہ سازش ہوں۔ تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ابھی اس نعرے میں خود باطل کی آمیزش ہے۔ اگر نعرہ ظاہر و باطن میں کلمہ حق اور اس کی جدوجہد کامل جہاد اور انقلاب ہو تو تمام مفاد پرست، دسیسہ کار، ابن الوقت اور مصلحت کوش عناصر کا اس کی مخالفت میں کمربستہ ہو جانا اشد ضروری ہے بلکہ یہی مخالفت و مزاحمت حق کی علامت ہے۔ اس لیے حق کا نام لینے والوں کو استقامت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں حق سے وابستگی کی بات ہو گی وہاں صبر و استقامت کی تلقین بھی ضرور کی گئی ہو گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ (العصر، ۱۰۳: ۱-۳)	زمانہ کی قسم بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (معاشرے میں) ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور باہم صبر کی تائید کرتے رہے۔

گویا کامیابی و کامرانی کی ضمانت جس ضابطے کی صورت میں قرآن بیان کر رہا ہے۔ وہ چار امور پر مشتمل ہے۔ ایمان، عمل صالح، تعاون بالحق اور استقامت بالصبر۔

جس طرح ایمان کو عمل صالح کے بغیر کمال نصیب نہیں ہو سکتا اسی طرح حق، صبر و استقامت کے بغیر کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی حق اور صبر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ صبر ہمیشہ تکلیف اور مصیبت میں کیا جاتا ہے۔ لہٰذا "حق اور صبر" کے باہمی تعلق سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حق کا نام لیتے ہی تکلیف اور مصیبت کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے حق کے فوراً بعد صبر اور استقامت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:-

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا
بیشک (اہل حق وہ لوگ ہیں) جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے۔ (حٰم السجدہ ۴۱: ۳۰)

یعنی خدا کو صحیح معنوں میں اپنا رب مان لینے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ باطل طاغوتی قوتوں کی مخالفت و مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لیے جو شخص دنیا کے ناخداؤں کی مصنوعی عظمت کا انکار کر کے ان کی سلطنت و حاکمیت کو ٹھکرا دے اور صرف اللہ تعالیٰ کی غلامی و بندگی کا دم بھرے تو اسے طرح طرح کے مصائب و آلام پیش آنے لگتے ہیں اور اس کلمہ حق کے بلند کرتے ہی صبر و استقامت کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حق کے نام لیواؤں کے پائے استقلال میں کسی سطح پر بھی تزلزل نہیں پیدا ہونا چاہیے۔

حصول مقصد میں کامیابی کا پختہ یقین

راہ حق میں استقامت اور فتح و کامرانی کے لیے جدوجہد میں کامیابی کا پختہ یقین اشد ضروری ہے۔ اگر جدوجہد کرنے والے کامیابی کے یقین سے محروم ہوں تو جدوجہد میں عزم و ولولہ اور جوش و خروش پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قرآن مجید میں کامیابی کی شرط کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے:-

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ
اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم

الاعلون ان كنتم مؤمنين (آل عمران ۳:۱۳۹) ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہو۔

نظام فکر و عمل کا یہ ضابطہ انسانی جدو جہد کو قوت یقین سے ہمکنار کرتا ہے اور مایوسی سے نجات عطا کرتا ہے۔ کیونکہ مایوسی و بے یقینی درحقیقت شیوہ کفر ہے۔ جب کہ اعتماد و یقین شیوہ ایمان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی بھی کام مایوسی اور بے دلی سے کیا جائے تو اس کے نتیجہ خیز ہونے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ اور اگر قوت یقین سے جدوجہد کی جائے تو راستے کی رکاوٹوں پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ کامیابی کا پختہ یقین سورہ فاتحہ سے اس طرح نصیب ہوتا ہے۔ کہ "**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ**" کے بعد فرمایا گیا ہے۔ **صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** (یہ راستہ ان لوگوں کا ہے جن پر تو نے انعام فرمایا ہے) منزل مقصود کے حصول میں کامیابی ہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام ہے اور انعام یافتہ بندے وہی ہیں جو اپنے ساحل مراد کو پا چکے ہیں۔ جو شخص ان کے راستے پر گامزن ہو گا۔ صاف ظاہر ہے وہ بھی یقیناً منزل مقصود تک پہنچ کر رہے گا اور اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہو گا۔ صاف ظاہر ہے وہ ضابطہ اس امر کی تلقین کرتا ہے کہ جدوجہد کو اس عزم و یقین کے ساتھ شروع کیا جائے کہ اس میں بہرصورت کامیابی حاصل ہوگی اور اس یقین میں کسی قسم کی کمی یا لچک روا نہیں رکھی جانی چاہیے۔

اہل حق کی پہچان اور ان کی مصاحبت و معاونت

راہ حق میں استقامت اور کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اہل حق کی پہچان پیدا کی جائے اور ان کی مصاحبت و رفاقت کا شرف حاصل کیا جائے۔ "**صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" کے الفاظ باری تعالیٰ کے مقبول و صالح اور انعام یافتہ بندوں کی پہچان اور ان سے تعلق و مصاحبت کی تعلیم دے رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی ہمراہی سے ہی ساحل مراد تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں اپنی انانیت اور خود غرضی سدراہ نہیں ہونی چاہیے، بلکہ حدیث رسول ﷺ "**المرء مع من احب**" (جو شخص جس سے محبت کرے گا، اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا) کے مطابق اہل حق کی مصاحبت اور محبت

آخرت میں بھی باعث نجات ہوگی؛ کیونکہ صراط مستقیم ان ہی کے راستے کا نام ہے۔ مزید یہ کہ جہاں جہاں بھی اہل حق دین اسلام کی خدمت میں مصروف ہوں اور راہ حق میں جدوجہد کر رہے ہوں۔ انکے ساتھ ہمیشہ تعاون اور رفاقت ضروری ہے۔

اہل باطل کی پہچان اور ان سے خصومت وعدم معاونت

جس طرح کلمہ اسلام کا جزو اول ' نفی اور اثبات دو ارکان پر مشتمل ہے اور حقانیت اسلام اور ابطال باطل دو جہتوں میں جدوجہد پر منحصر ہے۔ اسی طرح راہ حق میں استقامت کے لیے اہل حق کی پہچان کے علاوہ اہل باطل کی پہچان بھی اشد ضروری ہے تاکہ اہل حق سے تعلق اور اہل باطل سے خصومت و عدم تعاون کا رویہ اپنایا جا سکے۔ سورہ فاتحہ کے آخر میں یہی ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (الفاتحہ '۱:۷) نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر (باری تعالیٰ کا) غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔

گویا قرآن حکیم انعام یافتہ بندوں اور غضب یافتہ بندوں میں واضح امتیاز پیدا کر رہا ہے اور حکم دیتا ہے کہ انعام یافتہ بندوں کی راہ پر چلا جائے۔ یعنی ان کی مصاحبت ورفاقت اختیار کی جائے اور بدبختوں کی راہ سے اجتناب یعنی ان کی مصاحبت و رفاقت سے گریز کیا جائے۔ اسی امتیاز کو قائم رکھتے ہوئے راہ حق میں استقامت باقی رہ سکتی ہے۔ ورنہ حق و باطل کے اختلاط سے خود گمراہی کا احتمال قوی ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات میں سے اس صفت کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ **(الفتح '۲۹:۴۸)** وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نہایت شفیق ہیں۔

اسی تصور کو حدیث کی اصطلاح میں

الحب فی اللہ و البغض فی اللہ (بخاری '۱:۶) خدا کے لیے دوستی اور خدا کے لیے دشمنی

قرار دیا گیا ہے۔ اس ضابطے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی کہ اسلام

کسی سطح پر بھی حق اور باطل کے درمیان سمجھوتے کا روادار نہیں ہے۔ حق و باطل کا سمجھوتہ اسلام نہیں بلکہ صریح منافقت ہے۔ جو ہزاروں رویوں میں ہمارے کردار کا جزو بن چکی ہے۔ اگر منافقت اور باطل سے سمجھوتے کی گنجائش ہماری زندگی سے کلیتہً معدوم نہیں ہو جاتی، ہم حق کے مقاصد میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ سورہ فاتحہ کا اسلوب بیان، آٹھ ضوابط پر مشتمل اس نظام فکر و عمل کو پیش کر رہا ہے۔ اگر زندگی میں یہی نظام، عادت راسخہ کے طور پر بپا کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ زندگی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو۔

باب-۷

مضامین فاتحہ
کی
منطقی ترتیب

عصر حاضر کے بعض علماء نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ سورہ فاتحہ دعائیہ سورت ہے۔ اس لیے اس میں استدلال کا پہلو واضح نہیں ہے۔ یہ نقطہ نظر صحیح نہیں۔ ایسی غلط فہمی قرآن مجید کو کلام انسانی پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ کلام الٰہی ہونے کی بنا پر ہر لحاظ سے نمایاں انفرادیت اور امتیاز کا حامل ہے۔ قرآن مجید کا کوئی حصہ خواہ وہ دعائیہ ہو یا انشائیہ 'اخباریہ ہو یا بیانیہ الغرض ہر حال میں اس کا استدلالی پہلو نہایت قوی اور واضح ہوتا ہے۔ اس کے مضامین اور آیات بلکہ الفاظ بھی باہم منطقی ترتیب کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ ان کا معنوی ربط اور مربوط استدلال اسقدر نمایاں ہوتا ہے کہ آج تک تاریخ عالم کا کوئی کلام اس کی تمثیل نہیں بن سکا۔ سورت فاتحہ استدلالی پہلو کے اعتبار سے بھی سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اس کا ہر لفظ اور ہر آیت دعوٰی بھی ہے اور دلیل بھی۔ شروع سے آخر تک ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت ایک اعتبار سے دعوی پیش کرتی ہے۔ اور اس سے اگلی آیت اس دعوی کی دلیل قرار پا جاتی ہے یہی انداز سورہ فاتحہ کے پہلے لفظ سے آخری لفظ تک قائم ہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو "**الحمد لِلّٰہ**" دعوٰی ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "تمام تعریفوں اور خوبیوں کا مستحق صرف اللہ ہے"۔ "**رب العٰلمین**" اس دعوے کی دلیل ہے کہ وہ ساری کائنات کا پروردگار ہے"۔ صاف ظاہر ہے کہ جس نے کائنات کے ایک ایک ذرے اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ مخلوق کو پیدا کیا ہو' رفتہ رفتہ اسے کمالات باطنی سے نوازا ہو اور ہر ایک کو اپنی تربیت کے ذریعے منزل عروج تک پہنچایا ہو تو ان کمالات اور عنایات پر تعریف کا مستحق بھی وہی ہو گا۔ کوئی اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ گویا اس کا رب کائنات ہونا اس کے مستحق حمد ہونے کی دلیل قرار پا گیا۔

اب "**رب العٰلمین**" دعوی اور "**الرحمٰن الرحیم**" اس کی دلیل ہے۔ ربوبیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ رب اپنے ہر مربوب کو پستی سے اٹھا کر بام عروج تک پہنچا دے یعنی ہر کمال سے نواز دے یہ کام شفقت و عنایت کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا پوری

[illegible]

ہو۔ الرحمٰن اور الرحیم یہ دو ایسی صفات ہیں جن کے باعث اس کی رحمت دنیاو آخرت کے ایک ایک وجود پر چھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی رحمانیت و رحیمیت اس کی ربوبیت کی دلیل قرار پاگئیں۔ گویا وہ اس لیے رب کائنات ہے کہ وہ رحمان و رحیم ہے۔

اب **الرحمٰن الرحیم** دعوٰی ہے اور **مالک یوم الدین** اس کی دلیل **الرحمٰن الرحیم** کے دعوے کے ذریعے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ہر فرد کائنات پر اسی کی رحمتوں اور نعمتوں کا سایہ ہے اور ہر شخص اسی کے احسانات و انعامات سے نوازا جارہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس دنیا کے اختتام پر ہر ایک سے جواب طلبی وہی کرے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے پر جزاو سزا بھی وہی دے گا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ عنایات و احسانات تو کوئی اور کرے اور جواب طلبی ایسا شخص کرے جس نے جوابدہ پر پہلے کوئی احسان و انعام تک نہ کیا ہو۔ نعمتیں دینے والے کو اپنی نعمتوں کے صحیح یا غلط استعمال پر جواب طلبی کا بھی حق ہوتا ہے۔ رحمت کرنے والے کو غلط کاریوں پر سزا دینے کا بھی حق ہوتا ہے۔ لہٰذا جو لطف و کرم کرے گا۔ گرفت کا مالک بھی وہی ہوگا چونکہ باری تعالیٰ جزاو سزا کا مالک ہے۔ اس لیے یہ ثابت ہوا کہ ہر ایک پر نعمت اور رحمت بھی اسی کی ہو رہی ہے۔

اب "**مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ**" دعوی ہے اور "**اِيَّاكَ نَعْبُدُ**" اسکی دلیل کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ صرف اسی کا مستحق عبادت ہونا اس کے مالک یوم جزا ہونے کی دلیل یوں ہے کہ عبادت مکمل غلامی و بندگی کا نام ہے۔ جو شخص جس کی غلامی و بندگی کرتا ہے۔ اس کا مالک اور اس کی جزاو سزا کا مختار بھی وہی ہوتا ہے یہ ممکن نہیں کہ مالک کوئی اور ہو لیکن بندگی اور غلامی کسی اور کی کی جائے۔ لہٰذا جب ہم اس کے سوا کسی کو لائق عبادت نہیں سمجھتے تو اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ہمارا مالک اور جزاو سزا کا مختار بھی وہی ہے۔

اب "**اِيَّاكَ نَعْبُدُ**" دعوی ہے اور **اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** " اس کی دلیل۔ یعنی اس کا

مستعان مطلق ہونا اس کے معبود ہونے کی دلیل ہے۔ غلام کے لیے ضروری ہے کہ مدد بھی اسی سے چاہے۔ جس کی وہ بندگی کرتا ہے۔ آقاو مولا یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بندے کسی اور کے سامنے دامن سوال دراز کرتے پھریں۔ لہٰذا جب ہم ہر حال میں استعانت باری تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ رشتہ امید اس سے وابستہ کرتے ہیں' مانگتے اس سے ہیں اور دیتا بھی وہی ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ عبادت کسی اور کی کی جائے؟ جو دے گن بھی اسی کے گانے چاہئیں۔ جو مدد کرے غلامی و اطاعت بھی اسی کی ہونی چاہیے۔ اس لیے اس سے حقیقی استعانت کی طلب اسکے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے۔ اس سے یہ اخذ نہ کیا جائے کہ چونکہ اس دنیا میں انسان بھی انسان کی مدد کرتے ہیں اور انسان' انسانوں سے مدد چاہتے بھی ہیں کیونکہ یہ عالم' عالم اسباب ہے لہٰذا مدد مانگنے والا انسان اپنے محسن اور امداد کرنے والے انسان کی عبادت بھی کرے۔ ایسا ہرگز روا نہیں۔ کیونکہ مادی یا روحانی طور پر صاحب استطاعت انسانوں کو دوسروں کی مدد کرنے پر مامور بھی اسی مستعان حقیقی نے کیا ہے اور وہ فی الحقیقت امداد الٰہی کے ذریعہ و مظہر کے طور پر اپنا اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان سے ظاہری استعانت بھی درحقیقت باری تعالیٰ سے استعانت ہے۔ کیونکہ کبھی استعانت یا امداد بالواسطہ ہوتی ہے اور کبھی بلاواسطہ۔ لیکن دونوں حالتوں میں فیضان اسی مستعان حقیقی کا کارفرما ہوتا ہے۔ اس لیے عبادت کے لائق بھی وہی ہے جس نے ہر حال میں ہماری مدد کے سامان فراہم کر رکھے ہیں۔

اب "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" دعوی ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اسکی دلیل۔ وجہ یہ ہے کہ ہدایت باری تعالیٰ سے اس لیے مانگی جارہی ہے کہ وہ ہدایت عطا کرتا ہے۔ "ہدایت" سے بڑھ کر اور کونسی بہتر مدد ہو سکتی ہے۔ بھٹکے ہوؤں کو صحیح راستہ نصیب ہو جائے اور پریشان حالوں کو منزل مراد میسر آجائے تو اس سے بہتر اور کیا مدد مطلوب ہوگی۔ جب ہدایت جیسی امداد کا مالک وہ ہے تو اس سے استعانت کیوں نہ کی جائے۔ لہٰذا اس کا ہادی ہونا اس کے مستعان ہونے کی دلیل قرار پایا۔ جو راستہ دکھا سکے

یا منزل تک پہنچا سکے۔ سوال بھی اسی سے کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہی اس لائق ہے کہ اس سے سوال کیا جائے کیونکہ ساحل مراد تک پہنچانا اسی کے دست قدرت میں ہے۔

اب "**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ**" دعوی ہے اور "**صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" اس کی دلیل پہلے حصہ آیت میں سیدھا راستہ پوچھا جا رہا ہے۔ جب تک دنیا میں کوئی سیدھا راستہ موجود نہ ہو اور اس پر کچھ خوش نصیب پہلے سے گامزن نہ ہوں تو اس کی تمنا ہی عبث ہو گی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ "سیدھا راستہ موجود ہے اور وہ وہی ہے جس پر خدا کے کئی انعام یافتہ بندے چل رہے ہیں"۔ جس راستے پر چلنے سے خدا کا انعام نصیب ہوتا ہو اور بندے، خدا کے مقبول و مقرب ہو جاتے ہوں۔ وہی راستہ "صراط مستقیم" ہو گا۔ لہٰذا خدا کے بعض بندوں کا اس کے انعام سے نوازا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ مانگنے پر راہ ہدایت کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ اب "**صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" دعوای ہے اور "**غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ**" اس کی دلیل ہے۔ جن لوگوں پر خدا کا غضب ہوا ہو اور وہ راہ حق سے بھٹک چکے ہوں، جب ان کی راہ پر چلنے سے اور ان کی رفاقت و مصاحبت سے روکا جا رہا ہو تو صاف ظاہر ہے کہ جو خدا کے انعام یافتہ اور مقرب و مقبول بندے ہیں، ان کی راہ پر چلنے کا حکم ہو گا۔ ان کے دامن سے وابستہ ہونا اور ان کی رفاقت و مصاحبت اختیار کرنا ہی صراط مستقیم ہو گا۔ لہٰذا بھٹکے ہوؤں کی رفاقت کی ممانعت، صلحاء و مقبولین کی رفاقت و مصاحبت اختیار کرنے کی دلیل قرار پا گئی۔

آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہو گا کہ سورہ فاتحہ میں استدلالی پہلو کس قدر قوی اور واضح ہے بلکہ اس کے مضامین اور آیات کتنی منطقی ترتیب کے ساتھ باہم مربوط ہیں اگر آپ اس ترتیب کا عکس ذہن میں رکھیں یعنی پہلی آیت کو "دلیل مقدم" اور دوسری آیت کو دعوای تصور کریں تب بھی استدلال کا پہلو اسی طرح واضح اور قوی ہو گا۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز بیان ہے جو کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہو سکا۔

باب-۸

سورہ فاتحہ
اور
صفات باری تعالیٰ

اگر سورہ فاتحہ کے نفس مضمون پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں باری تعالیٰ کی بارہ صفات نمایاں طور پر بیان کی گئی ہیں- جن کا بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سورہ فاتحہ کا مضمون باری تعالیٰ کی معرفت علمی کے حصول کے لیے مینارۂ نور کا درجہ رکھتا ہے- وہ صفات درج ذیل ہیں:-

١- محمود ٢- اللہ ٣- رب ٤- رحمان ٥- رحیم ٦- مالک

٧- معبود ٨- مستعان ٩- ہادی ١٠- منعم ١١- قہار ١٢- مضل

محمود (جس کی تعریف کی جائے)

سورہ فاتحہ کا آغاز جس لفظ سے ہوا ہے- وہ باری تعالیٰ کے مستحق حمد ہونے کا اعلان کر رہا ہے- "**الحمد للہ**" یعنی وہی ذات فی الحقیقت حمد اور تعریف کیے جانے کی حقدار ہے- باری تعالیٰ کی یہ صفت قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:

اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (بنی اسرائیل '١٧:٤٤)
کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو-

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:-

لَہُ الْمُلْکُ وَ لَہُ الْحَمْدُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (التغابن ٦٤:١)
پوری کائنات کی بادشاہی بھی اسی کی ہے اور کل حمد یعنی تعریف بھی اسی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے-

اللہ (خالق کائنات جو تمام کمالات کا ذاتی طور پر مالک ہے)

الحمد للہ میں لفظ "اللہ" باری تعالیٰ کی صفت الوہیت پر دلالت کرتا ہے- یعنی جو ذات تمام تعریفوں کی مستحق ہے- وہی حقدار الوہیت ہے- وہی خالق ہے اور صرف وہی "اللہ" کہلانے کا حق رکھتی ہے- الہ اس ذات کو کہتے ہیں جو خالق کائنات ہو، خود ہر کمال کی مالک ہو اور ہر کمال کا منبع و سرچشمہ بھی ہو- ہر کمال اسی سے شروع ہوتا

ہو اور اسی پر ختم ہی ہوتا ہو ذات حق کی اس صفت خالقیت و الوہیت کا ذکر قرآن مجید میں یوں وارد ہوا ہے:-

وَ مَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (آل عمران ۳:۶۲)

اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ہی غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:-

ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (فاطر ۳۵:۳)

اللہ کے سوا کیا کوئی اور خالق ہے؟ جو آسمان اور زمین سے رزق عطا کرے، اس کے سوا کوئی الہ نہیں۔

رب (پروردگار)

رب العلمین کے الفاظ باری تعالیٰ کی صفت ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی وہی ذات ہر شے کو درجہ بدرجہ کمال پر پہنچانے والی ہے۔ "اللہ" کے بعد "رب" کی صفت بیان کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ انسان یہ جان سکے کہ باری تعالیٰ صرف خود ہی باکمال نہیں، بلکہ اپنی مخلوق کو بھی ہر ایک کے حسب حال کمال عطا کرتا ہے۔ صفت ربوبیت کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ کے ساتھ وارد ہوا ہے:-

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ ھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (الانعام ۶:۱۶۴)

فرما دیجئے کیا میں اللہ کے سوا کسی اور رب کی تلاش کروں حالانکہ وہ کائنات کی ہر شے کا رب یعنی پروردگار ہے۔

رحمان (نہایت مہربان)

ربوبیت کے بعد باری تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا ذکر ہے جس سے یہ حقیقت مترشح ہو رہی ہے کہ اس کی رحمت اس قدر وسیع اور بے پایاں ہے کہ کوئی ذی شعور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے کیونکہ جہاں جہاں تک اس کی ربوبیت حاوی ہے وہاں

وہاں تک اس کے چشمہ رحمانیت کا فیض بھی پہنچ رہا ہے۔ یہ ارشاد اس لیے فرمایا گیا کہ انسان ہمہ وقت حصول رحمت کے لیے اس کی ذات کی طرف متوجہ رہے۔ قرآن مجید میں اس کی شان رحمانیت کا ذکر اس طرح ہے:۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ (النبأ ۷۸:۳۷) — آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے کا پروردگار رحمٰن ہے۔

رحیم (رحم فرمانے والا)

رحمانیت کے بعد رحیمیت کا ذکر وہی علمی فائدہ پہنچا رہا ہے جو الوہیت کے بعد ربوبیت کے ذکر سے پہنچایا گیا تھا۔ یعنی خدا' اللہ ہونے کی بناء پر صرف خود ہی صاحب کمال نہیں بلکہ رب ہونے کی وجہ سے دوسروں کو بھی باکمال بناتا ہے۔ اسی طرح فرمایا گیا کہ خدا رحمان ہونے کی بنا پر صرف خود ہی پیکر رحمت نہیں بلکہ رحیم ہونے کی وجہ سے دوسروں کو بھی دولت رحمت سے نوازتا ہے۔ اس کی شان رحیمیت کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے:۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (الشعراء ۲۶:۹) — اور بے شک آپ کا رب ہی غالب رحم فرمانے والا ہے۔

مالک

رحمت باری تعالیٰ کے ذکر کے بعد اس کی شان مالکیت بیان کی گئی ہے۔ یوم جزا کا مالک ہونے سے یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ وہ صرف آخرت کا مالک ہے۔ دنیا کا نہیں۔ کیونکہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "مالک یوم الدین"۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت یا یوم جزا اس دنیا کا انجام ہے اور جو ہستی انجام کی مالک ہو۔ صاف ظاہر ہے آغاز و اوسط کی مالک بھی وہی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سفر حیات ایک ہو انسان بھی ایک ہو لیکن ہر مرحلے پر مالک بدلتے رہیں۔ باری تعالیٰ کی شان مالکیت قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:۔

اَلْملکُ یَوْمَئِذٍ لِلّٰہِ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ (الحج، ۲۲:۵۶) — اس دن بادشاہی صرف اللہ کی ہے۔ وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا گیا:-

فَتَعَالَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ (المومنون، ۲۳:۱۱۶) — پس بلند ہے اللہ، جو بادشاہ ہے اور حق ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی بزرگی والے عرش کا رب ہے۔

معبود (جس کی عبادت کی جائے)

شان مالکیت کے ذکر کے بعد "**ایاک نعبد**" کے الفاظ میں صفت معبودیت کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ وہ ذات جو سب حمد کی مستحق تھی، جو ہر ایک سے زیادہ باکمال تھی، سب سے بڑھ کر مہربان اور رحیم تھی، ہر ایک کی مالک اور جزا و سزا کی مختار تھی۔ وہی اس بات کی بھی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے یعنی اس کی بارگاہ میں سرنیاز خم کیا جائے۔ باری تعالٰی کی شان معبودیت کا بیان قرآن مجید میں اس طرح ہے:-

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ، ۲۰:۱۴) — بیشک اللہ میں ہی ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ پس میری عبادت کرو اور میری یاد کی خاطر نماز قائم کرو۔

مستعان (جس سے مدد مانگی جائے)

صفت معبودیت کے ذکر کے بعد "**اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ**" کے الفاظ میں باری تعالٰی کی شان مستعانیت بیان ہو رہی ہے۔ چونکہ معبود وہ ہے اس لیے جو استعانت شان معبودیت کے ساتھ مختص ہے، اس سے ہی کی جا سکتی ہے۔ ورنہ ظاہری استعانت تو عالم اسباب میں انسان انسانوں سے کرتے ہی رہتے ہیں اور نہ یہ ظاہری استعانت اس کی شان مستعانیت کے منافی ہے۔ باری تعالٰی کی صفت مستعانیت کا بیان قرآن مجید میں اس

عرض کیا ہے:-

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (یوسف ۱۲: ۱۸)

اب صبر ہی بہتر ہے اور اللہ سے مدد چاہتا ہوں ان باتوں پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:-

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (الانبیاء ۲۱: ۱۱۲)

اس نے کہا، اے رب! انصاف کے ساتھ فیصلہ فرما اور ہمارا رب رحمان ہے۔ اسی سے مدد چاہی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم بناتے ہو۔

ھادی (ہدایت دینے والا)

صفت مستعانیت کے ذکر کے بعد "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے الفاظ میں باری تعالیٰ کی شان ہادیت مذکور ہوئی ہے کہ وہی وہ ذات ہے جو ہر ایک کو ہدایت کی نعمت سے سرفراز کرتی ہے اور گمراہیوں سے بچاتی ہے۔ ہدایت عطا ہونے کے بعد استقامت کا نصیب ہونا بھی اسی کے فضل و کرم سے ممکن ہے۔ اس کی شان ہادیت کا بیان قرآن مجید میں اس طرح ہے:-

وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ (الزمر ۳۹: ۳۷)

اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت عطا کرے، اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ کیا اللہ تعالیٰ غالب، بدلہ لینے والا نہیں ہے۔

مُنعِم (انعام فرمانے والا)

باری تعالیٰ کی شان ہادیت کے تذکرے کے بعد "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کے الفاظ میں اس کی صفت منعمیت کا بیان موجود ہے۔ وہی وہ ذات ہے جو بندوں پر انعام کرتی ہے۔ اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت اور درجات قرب سے نوازتی ہے اور ان کا راستہ باقی بندگان خدا کے لیے لائق تقلید قرار دیتی ہے۔ قرآن مجید

میں اس کی شان کریمی کا ذکر یوں موجود ہے:-

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (النحل ۱۶: ۸۱)

اس طرح وہ تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کرتا ہے تاکہ تم ایمان لے آؤ-

قَهَّار (نافرمانوں پر قہر و غضب فرمانے والا)

اپنے لطف و کرم اور انعام و اکرام کے ذکر سے لوگوں کو امید رحمت عطا کرنے کے بعد اب انہیں اپنی شان قہاریت سے شناسا کر کے خوف عقاب دلا رہا ہے کہ جس طرح اطاعت گزار' خدا کے انعام سے نوازے جاتے ہیں اسی طرح نافرمان' خدا کے قہر و غضب کے مستحق بھی ٹھہرائے جاتے ہیں- چنانچہ "غیر المغضوب علیہم" کے الفاظ کی صورت میں باری تعالیٰ نے اپنی شان قہاریت کی جھلک دکھائی ہے- قرآن مجید میں ایک اور مقام پر اس صفت کا ذکر یوں آیا ہے:-

وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ (الفتح ۴۸: ۶)

اور اللہ تعالیٰ نے ان پر غضب فرمایا- اور ان کو اپنی رحمت سے دور کیا اور ان کے لیے جہنم تیار کی-

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے:-

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الرعد ۱۳: ۱۶)

فرما دیجئے اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے اور وہ اکیلا قہار ہے-

مُضِلّ (نافرمانوں کے لیے گمراہی کا راستہ کشادہ کرنے والا)

باری تعالیٰ نے اپنی شان قہاریت کے ذکر کے بعد "**ولا الضالین**" کے الفاظ میں صفت مضلیت کا بیان فرمایا ہے تاکہ نافرمانوں کو تنبیہہ ہو سکے کہ خدا کے قہر و غضب کی ہولناک اور عبرت ناک صورت راہ حق سے بھٹک جانا ہے- گمراہی سے بڑھ کر خدا کے غضب کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے- یہ صفت اسکی شان ہادیت کے مقابل ہے- جو لوگ بارگاہ ایزدی کی طرف نیاز مندی اور عاجزی کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں- ان کے

لیے ہدایت کے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں- جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:-

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(العنکبوت ۲۹:۶۹)

جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کشادہ کر دیتے ہیں۔

جو لوگ تمرد' انحراف اور نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس کی بارگاہ کی طرف رجوع نہیں کرتے ان کے لیے باری تعالیٰ کی شان مضلیت کے باعث گمراہی و ضلالت کے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں- اللہ تعالیٰ کی اس شان کا ذکر قرآن مجید میں یوں ملتا ہے:-

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا

(الکہف ۱۸:۱۷)

جسے اللہ تعالیٰ ہدایت عطا کر دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے گمراہ ہونے دے- پس آپ اس کے لیے کوئی ولی و مرشد نہ پائیں گے- یعنی کوئی راہ حق دکھانے والا ساتھی نہ پائیں گے-

یہ باری تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جن سے اسکی علمی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے- اس لحاظ سے سورہ فاتحہ معرفت الٰہی کا خزانہ بھی ہے اور اس کے وصال کا راستہ بھی-

باب-۹

سورہ فاتحہ
اور
صفات عبدیت

جس طرح اس سورت میں باری تعالیٰ کی بارہ صفات مذکور ہیں۔ اسی طرح ہر ایک صفت الوہیت کے مقابلے میں ایک صفت عبدیت ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ صفات عبدیت بھی تعداد میں بارہ ہی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ حامد ۲۔ مخلوق ۳۔ مربوب ۴۔ محتاج فی الدنیا (طالب رحمت)
۵۔ محتاج فی الاخرۃ (طالب رحمت) ۶۔ مملوک و محکوم
۷۔ عابد و مطیع ۸۔ مستعین و مستمد ۹۔ طالب ھدایت یا ھدایت یافتہ
۱۰۔ منعم علیہ یا انعام یافتہ ۱۱۔ مستحق قہر و غضب یا مغضوب و مقہور
۱۲۔ مستحق ضلالت یا گمراہ

حامد (حمد کرنے والا)

ذات باری تعالیٰ محمود ہے اور پوری کائنات میں سب سے اعلیٰ حامد انسان ہے۔ کیونکہ اسی کو سب سے زیادہ اس کے محاسن و کمالات کی معرفت ہے۔ انسان تمام مخلوقات پر سبقت و فضیلت بھی استعداد علم کی وسعت کے باعث رکھتا ہے۔ لہٰذا جس کو جس قدر وسعت علم نصیب ہوگی اسے اسی قدر کمالات ایزدی کی معرفت ہوگی اور جس کو جسقدر ذات حق کی معرفت نصیب ہوگی وہ اسی قدر اس کی حمد میں مستغرق ہو گا۔ جو جس قدر حمد باری تعالیٰ میں مگن ہو گا۔ وہ اسی قدر مخلوقات عالم میں یکتا و یگانہ ہو گا۔

مخلوق (جو پیدا کیا گیا ہو)

ذات باری تعالیٰ خالق ہے اور پوری کائنات اس کی مخلوق۔ لیکن انسان تمام مخلوقات میں سے افضل اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید کی درج ذیل آیت کریمہ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین ۹۵:۵)

بے شک ہم نے انسان کو سب سے بہتر حالت میں پیدا کیا ہے۔

گویا ذات حق کی شان خالقیت کا ظہور تام حضرت انسان کی تخلیق کی صورت میں ہوا۔ چونکہ وہ خود صاحب کمال ہے اس لیے اسنے اپنی تخلیق کے سب سے اعلیٰ نمونے کو جملہ کمالات کا نمونہ بنایا ہے۔

مربوب (جن کی تربیت کی گئی ہو)

باری تعالیٰ رب ہے اور انسان سب سے اعلیٰ اور کامل مربوب---- مربوب اس شخص کو کہتے ہیں جس کی تربیت کی گئی ہو اور تربیت اس Process یعنی طریقے کا نام ہے۔ جس میں مربی، تربیت پانے والے کے اندر رفتہ رفتہ اپنے کمالات اور محاسن و فضائل کی جھلک پیدا کر دے۔ جن جن کمالات سے مربی خود متصف ہوتا ہے۔ اگر وہ حسب حال مربوب یعنی تربیت یافتہ میں منتقل نہ کر سکے تو نہ اس کو کامل تربیت کہیں گے نہ مربی کو کامل مربی اور مربوب کو کامل مربوب۔ تربیت نام ہی اپنے فضائل و کمالات کا رنگ دوسرے میں درجہ بدرجہ منتقل کر دینے کا ہے۔ لہٰذا انسان باری تعالیٰ کا مربوب اتم ہونے کے باعث اس کی صفات حسن و کمال کا مظہر ہے۔ جس انسانی ہستی کو جس قدر تربیت الٰہی کا فیض نصیب ہو گا وہ اسی قدر کمالات ربانی کا مظہر اتم ہو گی۔

محتاج فی الدنیا (طالب رحمت)

باری تعالیٰ "رحمان الدنیا" ہے اور انسان اس کی رحمت کا محتاج ہے۔ چنانچہ صحیح معنوں میں انسان وہ ہے جو یہ سمجھے کہ میں ہر وقت اس کی رحمت اور فضل و عنایت کا محتاج ہوں اور اس کی طرف ہر حال میں راغب اور متوجہ رہے۔

محتاج فی الآخرۃ (طالب رحمت)

باری تعالیٰ "رحیم الآخرۃ" ہے اور انسان وہاں بھی اس کی رحمت کا محتاج ہے۔ درحقیقت انسان وہ ہے جو یہ سمجھے کہ آخرت میں میری بخشش و نجات میرے اعمال اور نیکیوں کی بناء پر نہیں بلکہ صرف خدا کی رحمت کے باعث ہو گی۔ یہی تعلیم نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو دی تھی۔ جس کا ذکر صحیح بخاری میں ہے۔

مملوک و محکوم (جو کسی کی ملکیت و محکومی میں ہو)

باری تعالیٰ یوم جزا کا مالک ہے اور انسان اس کی بارگاہ میں جواب دہ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ذات حق کی ملکیت مطلق ہے اور انسان ہر لحاظ سے اس کا غلام و محکوم ہے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ گویا وہ خود کو خدا کی غلامی و محکومی سے خارج تصور کرتا ہے۔ یہ امر آداب بندگی کے خلاف ہے اور جو شخص گناہ و معصیت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ گویا وہ خود کو خدا کے سامنے جواب دہ تصور نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ انسان کی خطا اور بھول ہے۔ ورنہ وہ روز ازل سے روز آخر تک باری تعالے کی غلامی میں ہے اور اسی کے سامنے اس نے اپنے ہر عمل کا جواب دینا ہے۔

عابد و مطیع

باری تعالیٰ معبود ہے اور انسان اس کا بندہ و مطیع۔ انسان کا کام خدا کی عبادت اور اطاعت ہے۔ جو شخص اس سے گریزاں ہو وہ گویا اس کی معبودیت و الوہیت کا منکر ہے۔ خدا کی اطاعت و بندگی سے دور رہ کر انسانیت کا کوئی تصور بھی ممکن نہیں۔ یوں تو کائنات ارض و سما کا ایک ایک وجود خدا کا عبد یعنی بندہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:-

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا	جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب کے سب رحمان کی بارگاہ میں بندے کے طور پر پیش ہونے والے ہیں (مریم ۱۹: ۹۳)

لیکن انسان شان عبدیت میں سب سے بلند و بالا ہے۔ معبودیت میں ذات باری تعالیٰ یکتائے کائنات ہے اور عبدیت میں وجود انسان ارفع کائنات ہے۔

مستعین و مستمد

باری تعالیٰ مستعان ہے اور بندہ اس کی بارگاہ میں مستعین و مستمد ہے یعنی مدد

چاہنے والا ہے۔ انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسانیت اور بندگی یہی ہے کہ ہر لمحہ خدا کی مدد پر نظر رکھی جائے اور اگر نظر امداد الٰہی پر ہو تو مایوسی و بے یقینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

طالب ہدایت یا ہدایت یافتہ

باری تعالیٰ ہادی ہے اور انسان اس کی ہدایت کا طالب و ضرورت مند۔ جب بندہ اس کی ہدایت صدق دل سے طلب کرتا ہے تو ذات حق اسے اپنی نعمت ہدایت سے بہرہ ور کر دیتی ہے اور پھر وہ مخلوق خدا کے لیے ہدایت ربانی کا مظہر بن جاتا ہے۔

منعم علیہ یا انعام یافتہ

باری تعالیٰ منعم ہے اور انسان اس کی نوازشوں کا مرکز۔ جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب ذات حق کسی بندے کو اپنے انعام سے نوازتی ہے تو دیگر مخلوق کا میلان طبع اس کی طرف کر دیتی ہے اور اسے زمین و آسمان میں قبول عام نصیب ہو جاتا ہے۔ اس انعام یافتہ بندے سے تعلق و مصاحبت کی راہ ہی بندگان خدا کے لیے صراط مستقیم قرار پا جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کو حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے:۔

ان اللہ اذا احب عبدا دعا جبرئیل فقال انی احب فلانا فاحبہ قال فیحبہ جبریل ثم ینادی فی السماء فیقول ان اللہ یحب فلانا فاحبوہ فیحبہ اھل السماء ثم یوضع لہ القبول فی الارض (صحیح المسلم، ۲: ۳۳۱) (جامع الترمذی، ۲: ۱۴۹)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل کو بلا کر فرماتے ہیں کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ پس جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ آسمان میں ندا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں تم بھی اس

سے محبت کرو۔ پس اہل آسمان اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس شخص کے لیے اہل زمین کے دل میں محبت و مقبولیت ڈال دی جاتی ہے۔

چنانچہ جس شخص پر خدا کا انعام ہوتا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کا نہیں بلکہ مقبول انام بھی ہو جاتا ہے تاکہ لوگ اس سے رغبت رکھیں' اس سے وابستہ ہوں اور وہ بھی اس کی مصاحبت کی برکت سے خدا کے انعام کے مستحق بن جائیں۔

مستحق قہر و غضب

باری تعالیٰ' نافرمانوں کے حق میں قہار ہے۔ اگر انسان اس کی رحمت اور نعمت سے منہ موڑ لے اور اس کے انعام یافتہ بندوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنے لیے نئی راہ منتخب کر لے تو وہ اس کے قہر و غضب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء ۴:۱۱۵)

جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنین (یعنی خدا کے انعام یافتہ بندوں) کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اپنا لے تو ہم اسے اس کی گمراہی میں بھٹکنے دیتے ہیں اور بالآخر جہنم میں ڈالتے ہیں اور وہ نہایت برا ٹھکانہ ہے۔

مستحق ضلالت

جو لوگ غضب الٰہی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ ان پر خدا کی شان مضلیت کا پرتو ہوتا ہے اور بالآخر وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسان باری تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں کی راہ اپنا لے تو وہ بھی ان کے ساتھ مستحق نعمت اور انعام یافتہ قرار پا

جاتا ہے اور اگر ان کے راہ سے ہٹ جائے تو خدا کے قہر و غضب کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے گمراہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے اپنی بدبختی اور گمراہی کا کبھی احساس بھی نہیں ہوتا کہ تائب ہو سکے۔ سورہ فاتحہ نے صفات عبدیت کا بیان اس انداز سے کیا ہے کہ حق و باطل اور خیر و شر کا امتیاز بھی واضح کر دیا گیا ہے اور نیک و بد کی تفریق بھی اجاگر کر دی گئی ہے تاکہ جو چاہے اہل ایمان کی راہ اپنا لے اور جو چاہے اہل کفر کی راہ اختیار کر لے۔

باب-۱۰

خدا اور بندے
کا
پنج جہتی تعلق

سورہ فاتحہ میں باری تعالٰی نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ بندے کا اپنے رب کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اگر اسلوب سورت کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس میں بندے کا اپنے رب کے ساتھ پانچ قسم کا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ اسی لیے باری تعالٰی نے سورہ فاتحہ کے آغاز میں اپنے پانچ اسماء بیان کیے ہیں:-

اللہ' رب' رحمان' رحیم اور مالک

ہر اسم مبارک بندے اور خدا کے درمیان کسی نہ کسی تعلق کی نوعیت کو متعین کرتا ہے۔ اس لحاظ سے بندے کے تعلق باللہ کی بھی پانچ جہتیں سامنے آتی ہیں:-

عبودیت' استعانت' طلب ہدایت' طلب استقامت اور طلب نعمت

سب سے پہلا اسم "اللہ" بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ **"الحمد لِلّٰہ"** کے الفاظ سے ثابت ہے۔ لفظ اللہ باری تعالٰی کی صفت الوہیت کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ بندے کا تعلق عبودیت منسلک ہے۔ عبودیت' اللہ کی عبادت سے عبارت ہے۔ ارشاد باری تعالٰی ہے:-

اِیَّاکَ نَعْبُدُ (**الفاتحہ'**۱:۴) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

اللہ تعالٰی اپنی صفت الوہیت کے اعتبار سے بندے کی عبادت کا مستحق ہے اور بندہ اپنی صفت عبودیت کے اعتبار سے اس کی عبادت و بندگی کا پابند ہے۔ اس لیے بندگان خدا کی زبان سے یہ کہلوایا گیا:-

اِیَّاکَ نَعْبُدُ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

اس حصہ آیت کا تعلق پہلی آیت کے ابتدائی الفاظ **"الحمد لِلّٰہ"** سے ہے۔ انسان بارگاہ ایزدی میں نیاز مندانہ التجا کرتے ہوئے عرض پرداز ہوتا ہے کہ "اے باری تعالٰی! ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ "اللہ" صرف تو ہے یعنی شان الوہیت کا سزاوار تیرے سوا کوئی نہیں"۔ وہ ذات "اللہ" ہے۔ اس لیے بندے کو عبودیت کے تعلق سے اس کے دامن الوہیت کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے۔ لہٰذا **اللہ اور ایاک نعبد**

کا باہمی تعلق یہ ہوا کہ وہ ذات تاجِ الوہیت کی مالک ہے اور بندے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ عبادت و بندگی کا تعلق پیدا کرے۔ **اِیَّاکَ نَعْبُدُ** کا اعلان اس کی شان الوہیت اور اس کے مقابلے میں اپنے مقام بندگی کا اعتراف ہے۔ یہ بندے اور خدا کے درمیان تعلق کی پہلی نوعیت ہے۔

دوسرا اسم مبارک "رب" بیان ہوا ہے۔ رب لغوی معنی کے اعتبار سے رفتہ رفتہ کسی کو ادنیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچانے والے کو کہتے ہیں۔ گویا باری تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر مخلوق کو تدریجاً اس کے نقطۂ کمال تک پہنچائے۔ مخلوق کے لیے یہی حقیقی مدد ہے کہ جس کمال کے حصول کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اسے تربیت دے کر وہاں تک پہنچا دیا جائے یعنی ہر ایک کو اپنی منزل کمال تک پہنچنے کے قابل بنا دیا جائے۔ باری تعالیٰ کی یہ شان "**رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ**" کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

اس حصہ آیت کا تعلق "**اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ**" کے الفاظ سے ہے۔ جہاں انسان بارگاہ ربوبیت میں یہ عرض کرتا ہے کہ "اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں" کیونکہ ساری کائنات کا رب، پالنے والا اور ہر شے کی تکمیل کے تقاضے پورے کرنے والا صرف تو ہے۔ ربوبیت، مخلوقات عالم کی امداد سے عبارت ہے۔ اس لیے بندے کا تعلق استعانت اسی کے دامن ربوبیت سے منسلک رہنا چاہیے۔ ذات حق کا پہلا اسم "اللہ" تھا۔ اس کے ساتھ انسان کا پہلا تعلق، عبادت کا قائم ہو گیا۔ دوسرا اسم "رب" ہے۔ اس کے ساتھ انسان کا دوسرا تعلق، استعانت یعنی طلب مدد کا قائم ہو گیا۔

باری تعالیٰ کا تیسرا اسم مبارک جو سورہ فاتحہ میں بیان ہوا ہے "**رحمان**" ہے۔ اس کے عام معنی "دنیا میں ہر ایک پر نہایت مہربانی کرنے والے" کے ہیں۔ ہر شخص کو اس دنیا میں ہدایت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ گمراہیوں اور ضلالتوں سے بچتا ہوا امن و عافیت کے ساتھ ساحل مراد تک پہنچ سکے۔ چنانچہ "**اِھْدِنَا**" (اے باری تعالیٰ! ہمیں دولت ہدایت سے ہمکنار فرما) کی دعا کے ذریعے انسان ذات رحمان کے ساتھ طلب ہدایت کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ ہدایت کی ضرورت بھی بندے کو اسی دنیا میں ہوتی ہے اور

ذات حق کے چشمہ رحمانیت کا فیض بھی زیادہ تر اسی دنیا سے متعلق ہے اس لیے "رحمان" اور "اھدنا" کے باہمی تعلق کی بنا پر بندے کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہر قدم پر راہ راست کی ہدایت طلب کرنے کا تعلق بھی ذات باری تعالیٰ سے ہی قائم کیا جائے۔ یہ بندے اور خدا کے درمیان تعلق کی تیسری نوعیت ہے۔

چوتھا اسم مبارک "رحیم" بیان ہوا ہے جس کا اطلاق ایک اعتبار سے آخرت کی رحمت پر ہوتا ہے۔ آخرت میں رحمت الٰہی کا استحقاق صاف ظاہر ہے استقامت کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس اسم مبارک سے تعلق کے لیے **"الصراط المستقیم"** کے الفاظ دعا کے طور پر وارد کیے گئے۔ یعنی "اے باری تعالیٰ! سیدھا اور استقامت والا راستہ دکھا۔" یہاں باری تعالیٰ کے دامن رحیمیت کے ساتھ بندے کا طلب استقامت کے حوالے سے تعلق قائم کیا گیا ہے کہ انسان بارگاہ رحیمیت سے استقامت طلب کرے تاکہ آخرت کی رحمت کا حقدار بن سکے۔ دنیا کی رحمت تو انسان کے عمل اور سیرت و کردار کے حوالے کے بغیر ہی میسر آجاتی ہے۔ کیونکہ یہ رحمت مخلوقات کو زندہ رکھنے کے لیے ہے۔ مگر آخرت کی رحمت کے لیے ہدایت و استقامت کی بناء پر استحقاق کا پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔

پانچواں اسم مبارک "مالک" ہے۔ اس کا بیان بالخصوص جزاو سزا کے دن کی مالکیت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جزاو سزا کا دن وہ آخری دن ہے۔ جب لوگ خدا کی نعمت یا اس کے غضب کے حقدار ہوں گے۔

ادھر ارشاد فرمایا گیا:۔

مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ (الفاتحہ '۱:۳) وہ یوم جزا کا مالک ہے۔

دوسری طرف خدا کے انعام و اکرام اور قہرو غضب کا ذکر ہے:۔

صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ (الفاتحہ '۱:۷)

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ نہ کہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ بھٹکے ہوؤں کا

یہ شان بلا شک و شبہ مالک کی ہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے غلاموں پر عنایات کرتا ہے یا ان کی غلط کاریوں پر ناراض ہو کر سزا دیتا ہے۔ ادھر اس ذات کی شان مالکیت کا ذکر ہے۔ ادھر بندے کو طلب نعمت کی تلقین ہے اور ساتھ ہی غضب و ضلالت سے پناہ مانگنے کا بھی حکم ہے۔ گویا بندے کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ اے انسان! ذات حق شان الوہیت کی سزاوار ہے اس لیے اس سے عبادت و بندگی کا تعلق پیدا کر، وہ شان ربوبیت کی سزاوار ہے۔ اس لیے اس سے طلب نعمت کا تعلق پیدا کر، اگر انسان یہ پانچوں قسم کے تعلق اخلاص کے ساتھ ذات باری تعالیٰ سے استوار کر لے تو صحیح معنوں میں مقام بندگی سے آشنا ہو جائے گا۔ مقام بندگی بارگاہ ایزدی میں سراسر عاجزی اور نیاز مندی کا نام ہے۔ جسے علامہ اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں:۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی   مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

تری دنیا جہان مرغ و ماہی   مری دنیا فغان صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور   مری دنیا میں تیری پادشاہی

جب انسان اپنی شخصیت کے ہر گوشے کا تعلق ذات حق کے ساتھ وابستہ کر لیتا ہے اور اس تعلق کو پختہ بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے تو ذات حق کا فیضان الوہیت اسے یکتائے روزگار بنا دیتا ہے۔ اس کا فیضان ربوبیت اسے ہر لحاظ سے منتہائے کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ اس کا فیضان رحمانیت اسے ابدی بقا و غنا کی دولت سے بہرہ ور کر دیتا ہے۔ اس کا فیضان رحیمیت اسے راہ حق میں استقامت و استقلال سے نواز دیتا ہے اور اس کا فیضان مالکیت اسے کائنات کی ساری نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ پھر وہ اس کا عام بندہ نہیں بلکہ خاص بندہ ہو جاتا ہے۔ اسے دنیا و آخرت میں خصوصی شرف و تکریم سے نواز دیا جاتا ہے اور وہ دیگر مخلوق کے لیے اپنے رب کریم کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ جیسا کہ خضر علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا:۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکہف:۱۸:۶۵)

پس انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک خاص بندے کو پایا' جسے ہم نے اپنی طرف سے خصوصی رحمت کے ساتھ نواز رکھا تھا اور اسے اپنی طرف سے خصوصی علم عطا کر رکھا تھا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں بندہ خدا کا محب ہونے کے علاوہ اس کا محبوب بن جاتا ہے اور قدرت الٰہی ہر گھڑی اس کی ہر آرزو کی تکمیل کرتی ہے۔ جب بندہ ہر لحاظ سے خدا کا ہو جائے تو خدا بھی ہر لحاظ سے اسی کا ہو جاتا ہے۔ اب بندے کی آرزو اور خدا کی رضا کے درمیان کوئی تخالف یا تضاد ممکن نہیں رہتا۔ بندے کی آرزو' رضائے الٰہی کے مطابق اور رضائے الٰہی بندے کی آرزو کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے میں الجھن انہی لوگوں کو واقع ہوتی ہے۔ جو مقام بندگی سے کماحقہ' واقف نہیں ہوتے اور جن کے پیش نظر "عبد" اور "عبدہ" کا فرق نہیں ہوتا۔ بقول اقبال"

عبد دیگر عبدہ' چیزے دیگر آں سراپا انتظار او منتظر

اسماء خمسہ اور معراجِ انسانی

سورہ فاتحہ میں اسماء خمسہ (اللہ' رب' رحمان' رحیم' اور مالک) کے بیان کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ان کے فیضان سے انسان کو معراج نصیب ہوتی ہے۔ انسانی ظہور کے پانچ مراتب ہیں:-

خلق' تربیت' بقاء' تکمیل اور نقل روح

سب سے پہلے جب انسان کو عدم سے وجود میں لایا گیا تو یہ اس کے ظہور کا پہلا مرتبہ تھا جسے خلق کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ باری تعالٰی کا اسم "اللہ" اس کی شان خالقیت پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو فیضان الوہیت سے خلعت وجود نصیب ہوئی تو اس کی خلق کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد انسان کی تربیت کی گئی یعنی اسے اعلیٰ مقام کی طرف

پرواز کے قابل بنایا گیا۔ یہ باری تعالیٰ کی ربوبیت کا فیضان تھا۔ اس کے بعد انسان کو اس دنیا میں بقا عطا کی گئی اور اس کے مصالح و حکم سے نوازا گیا۔ یہ باری تعالیٰ کی رحمانیت کا فیضان تھا۔ اس کے بعد اسے منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ باری تعالیٰ کی رحیمیت کا فیضان ہے اور آخر میں انسانی روح عالم شہادت سے عالم برزخ کی طرف اور بعد ازاں عالم آخرت کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ یہ اس کی مالکیت کا فیضان ہے۔ الغرض خلق سے نقل روح تک تمام مراحل باری تعالیٰ ہی کے فضل و انعام سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

ان اسماء مبارکہ کے فیضان سے انسان کو معراج اس طرح نصیب ہوتی ہے کہ جب پڑھنے والا سورہ فاتحہ کی تلاوت کا آغاز کرے وہ اس کے الفاظ کے ساتھ ان کے معانی و معارف کے سمندروں میں بھی غوطہ زن رہے۔ جب اس کی زبان سے "الحمد للہ" کے کلمات نکلیں تو اس وقت پڑھنے والا رب ذوالجلال کے اسم "اللہ" کی طرف توجہ کرتے ہوئے اسے خلق اور ایجاد و تکوین کائنات کا منبع و سرچشمہ دیکھے۔ ادھر اپنی خلق کا مرتبہ اس کی نظروں کے سامنے ہو اور وہ یہ محسوس کرے کہ اس کا وجود میں آنا باری تعالیٰ کی شان خالقیت کا پرتو ہے۔ جس کا ظہور "اللہ" سے ہو رہا ہے۔ جب وہ "رب العٰلمین" کہے تو اسکی توجہ رب ذوالجلال کے اسم "رب" کی طرف ہو اور اسے ہی تربیت موجودات کا منبع و سرچشمہ دیکھے۔ مزید برآں وہ یہ محسوس کرے کہ میرا پرورش پانا اور ارتقاء پذیر ہونا باری تعالیٰ کی شان ربوبیت کا پرتو ہے۔ جس کا ظہور "رب العٰلمین" سے ہو رہا ہے۔ جب "الرحمان" کہے تو اس کی توجہ رب ذوالجلال کی شان رحمانیت کی طرف ہو جو تمام مخلوقات عالم کی بقا کی ضامن ہے۔ وہ یہ محسوس کرے کہ میری بقاء ہر لحہ اس کی شان رحمانیت کا پرتو ہے جس کا ظہور "الرحمٰن" سے ہو رہا ہے۔ جب "الرحیم" کہے تو اس کی توجہ رب ذوالجلال کی شان رحیمیت کی طرف ہو جو تمام مخلوقات کی تکمیل کی ضامن ہے اور وہ یہ محسوس کرے کہ میرا ہر کمال اس کی شان رحیمیت کا پرتو ہے۔ جس کا ظہور "الرحیم" سے ہو رہا ہے۔ جب وہ "مالک یوم الدین" کہے تو اس کی توجہ رب ذوالجلال کی شان مالکیت کی طرف ہو اور وہ یہ سمجھے کہ میری

نقل روح اسی کی بارگاہ میں حاضری کے لیے ہے۔ الغرض **الحمد للہ** کے الفاظ سے مرتبہ خلق کا پردہ اٹھتا ہے اور انسان خدا کے جلووں کو خالقیت کے روپ میں آشکار دیکھتا ہے۔ **رب العٰلمین** کے الفاظ سے مرتبہ تربیت کا پردہ اٹھتا ہے اور انسان خدا کے جلووٴں کو رحمانیت کے روپ میں آشکار دیکھتا ہے۔ **الرحیم** کے الفاظ سے مرتبہ کمال کا پردہ اٹھتا ہے اور انسان خدا کے جلووں کو رحیمیت کے روپ میں آشکار دیکھتا ہے۔ **مالک یوم الدین** کے الفاظ سے مرتبہ نقل روح کا پردہ اٹھتا ہے اور انسان خدا کے جلووں کو مالکیت کے روپ میں آشکار دیکھتا ہے۔ گویا اول سے آخر تک ہر طرف خدا کے جلووں کو موجود پاکر انسان خود کو اس کے حضور میں معدوم پاتا ہے اور ہر طرف اس کے جلوے کو بے نقاب دیکھ کر صیغۂ خطاب سے پکار اٹھتا ہے:-

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

(الفاتحہ' ۱:۴)

(اے باری تعالیٰ) ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں (کیونکہ موجود حقیقی صرف تو ہے) اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں (کیونکہ متصرف حقیقی صرف تو ہے)۔

جب انسان نے خلق و تربیت' بقا و کمال اور نقل روح' ہر مرحلے پر خود کو تصور ذات میں گم کردیا بلکہ اپنی ہستی کو اس کی ہستی کے تصور میں فنا کردیا تو اسے مشاہدہ حق نصیب ہو گیا۔ اسی لیے اس نے سورہ فاتحہ کی تلاوت کے دوران صیغۂ غیب سے دفعتاً "صیغۂ خطاب" کی طرف التفات کرلیا پہلی تین آیات میں ذکر الٰہی صیغۂ غیب کے ساتھ تھا۔ (تمام تعریفوں کا مستحق صرف اللہ ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ جو رحمان و رحیم ہے۔ جو یوم جزا کا مالک ہے) یہاں پہنچ کر جب تمام حجابات مرتفع ہوئے۔ ہر سو ذات حق کے جلوے دکھائی دینے لگے اور انسان کی ہستی ان جلووں میں گم ہو گئی تو انسان عالم غیب سے عالم شہادت کی طرف متوجہ ہوا اور براہ راست خطاب کے انداز سے اپنے رب کو پکار کر کہنے لگا۔ "اے معبود برحق! ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی

سے مدد چاہتے ہیں۔ کلام میں غیب سے خطاب کی طرف التفات اس بات کی دلیل ہے کہ اب مشاہدہ ذات کا وقت آگیا ہے۔ یہی مقام مشاہدہ انسان کی حقیقی معراج ہے۔ لیکن مقام شہود کی یہ معراج فنائے تام کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی۔ بقول اقبالؒ

شہود کیسے ہو حاصل اسے زمانے میں وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

یہ معراج جو سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت کے مقام پر نصیب ہو رہی ہے۔ حدیث رسول ﷺ میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی

ما الاحسان (یا رسول اللہ احسان کیا ہے) حضور ﷺ نے فرمایا:۔

الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک	احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس حال میں کرے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔
(صحیح بخاری ۱:۱۲ کتاب ایمان)	پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو بے شک وہ تجھے دیکھتا ہی ہے۔

یہ ترجمہ طریقہ صوفیاء پر کیا گیا ہے۔ جسے کئی محدثین نے بھی نقل کیا ہے۔ گویا آنحضرت ﷺ نے انسان کو مقام شہود پر پہنچانے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ بقول حضور خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

دلا بحلقہ رندان بزم عشق درآ کہ جرعہ ز شراب بقا دہند ترا
اگر بقا طلبی اولت فنا باید کہ تافنا نشوی رہ نمی بری بہ بقا

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے قبل **مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ** وارد ہوا ہے۔ یہ آیت مرتبہ نقل روح کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یعنی انسان کے دار دنیا سے دار جزا کی طرف منتقل ہو کر بارگاہ ایزدی میں حاضری کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد انسان اپنا کلام غیبت سے حضور کے صیغے کی طرف منتقل کرتا ہے۔ گویا وہ دار فانی کو چھوڑ کر جب دار بقا میں اپنے رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے جلوہ ذات کا دیدار کرتا ہے تو عرض کرتا ہے کہ "ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"

انسان کا بارگاہ ایزدی سے دوری کی بجائے قرب، غیب کی بجائے حضور اور محرومی

دیدار کی بجائے شرف وصال سے نوازا جانا ہی حقیقی معراج ہے جو سورہ فاتحہ اور اسمائے خمسہ کے فیضان سے نصیب ہوتی ہے۔ یہ سب احوال صرف اس صورت میں میسر آتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ کی تلاوت کے دوران انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر اور ان کے معانی و معارف کے سمندروں میں اس طرح غوطہ زن ہو کہ ہر ہر لفظ کی تلاوت سے عنایات ربانی کا مستحق ٹھہر رہا ہو اور اسے یوں محسوس ہو کہ وہ حضور ایزدی میں کھڑا ہو کر ذات حق سے ہمکلام ہے اور وہ ذات لحہ بہ لحہ اپنی توجہ و التفات اور لطف و کرم سے مجھے نواز رہی ہے۔ لہٰذا "**اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ**" کا اسمائے خمسہ سے تعلق یہی ہے کہ "اے باری تعالیٰ! ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ تو اللہ ہے اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں کیونکہ تو رب ہے، ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ تو رحمان ہے اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں کیونکہ تو رحیم ہے۔ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ تو ملک یعنی بادشاہ ہے اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں کیونکہ تو مالک ہے"۔

باب-۱۱

سورہ فاتحہ
اور
پانچ بنیادی ضابطے

سورہ فاتحہ اور ضابطہ عبادت

تمام عبادات میں سے اعلیٰ وارفع عبادت نماز ہے جو سات (۷) ظاہری اعمال سے مرکب ہے۔ سورہ فاتحہ اس اعلیٰ عبادت کا روحانی ضابطہ اس طرح مہیا کرتی ہے کہ یہ بھی سات (۷) آیات پر مشتمل ہے اور اس کی ہر ہر آیت اپنی روح معنوی کے اعتبار سے نماز کے ایک ایک عمل کی روح کی تکمیل کرتی ہے۔ سب سے پہلا عمل "تکبیر تحریمہ" ہے۔ جس سے نماز کا آغاز ہوتا ہے۔ تکبیر تحریمہ میں انسان اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کانوں کے مساوی لے جاتا ہے اور اللہ اکبر کہتا ہے۔ یہ باری تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس ہے اور اس کی خاطر اپنے ہاتھ یعنی اپنا شغف و انہماک ساری کائنات سے اٹھا لینے کا اعلان ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے انسان تمام تعریفات و تسبیحات کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔ جس کا صاف معنی یہ ہے کہ وہ فی الحقیقت جملہ مخلوقات کے حسن و خوبی، جمال و کمال اور ان کے مستحق تعریف ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ یعنی ہر صاحب کمال سے نظر صرف رب ذوالجلال کی طرف مرکوز کر رہا ہے۔ گویا نماز میں انسان دنیا کے شغف و انہماک سے ہاتھ اٹھا کر پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کی عبادت میں داخل ہوتا ہے ادھر سورہ فاتحہ میں انسان تمام خوبیوں اور تعریفوں کا منبع و سرچشمہ صرف رب کائنات کو قرار دے کر، ہر ایک سے صرف نظر کرتے ہوئے پوری یکجہتی کے ساتھ خدا کی یاد میں مگن ہوتا ہے۔ اس لیے تکبیر تحریمہ کا حقیقی مدعا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے پورا ہو جاتا ہے۔

نماز کا دوسرا عمل قیام ہے۔ قیام، سکون و اطمینان کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ حالت قیام میں آدمی بغیر کسی نقل و حرکت کے دست بستہ بارگاہ ایزدی میں کھڑا رہتا ہے۔ سورہ فاتحہ کی دوسری آیت الرحمٰن الرحیم ہے۔ جس میں باری تعالیٰ کی رحمت کا ذکر ہے۔ رحمت، سکون و اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے دوسری آیت سے

[illegible] کی تکمیل ہوتی ہے۔

نماز کا تیسرا عمل "رکوع" ہے۔ رکوع گھٹنوں کے بل جھک جانے کو کہتے ہیں۔ ادھر سورہ فاتحہ میں تیسری آیت **مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ** ہے۔ جس میں باری تعالیٰ کی مالکیت یعنی بادشاہی اور حکومت و سلطنت کا ذکر ہے۔ جونہی خدا کی بادشاہی کا ذکر آتا ہے انسان اس کی ہیبت و جلال کے پیش نظر اس کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔ اسی حالت کا نام رکوع ہے۔ گویا اس آیت سے فی الحقیقت روح رکوع کی تکمیل ہوتی ہے۔

نماز کا چوتھا عمل "قومہ" ہے۔ یہ حالت رکوع سے اٹھ کر کھڑا ہونا ہے جو فی الواقع سجدے کی تیاری سے عبارت ہے۔ ادھر سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت میں **اِيَّاكَ نَعْبُدُ** کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ یہ عبادت در حقیقت استعانت کی تیاری ہے کہ خدا کے سامنے عجز و انکساری کے ساتھ اپنی بندگی کا اظہار کر کے اس سے مدد طلب کی جائے تو انسان اعانت الٰہی کا زیادہ مستحق ہو جاتا ہے۔

نماز کا پانچواں عمل "سجدہ" ہے۔ جس پر قومہ کے فوراً بعد انسان سجدے میں گر جاتا ہے۔ اس طرح ذکر عبادت کے فوراً بعد انسان **اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** کے ذریعے بارگاہ ایزدی سے مدد طلب کرتا ہے۔ سجدہ خدا کی بارگاہ میں تواضع، انکساری اور بندگی و عجز کے اعتراف کی آخری حالت ہے۔ جس میں انسان اپنے گھٹنے، پاؤں، ہاتھ پیشانی اور ناک یعنی سب کچھ خاک پر رکھ دیتا ہے۔ سر کو حضور الٰہی میں رکھ دینے سے بڑھ کر اور کیا بندگی ہو گی۔ چنانچہ سجدہ در حقیقت **اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** کی عملی صورت ہے۔ گویا انسان زمین پر گر کر عرض پرداز ہوتا ہے کہ اے باری تعالیٰ! میری کمزوری، ناتوانی اور عجز کا تو یہ عالم ہے کہ میں تیری بارگاہ میں گرا پڑا ہوں۔ میرے لیے تیرے در کے سوا اور کوئی در نہیں۔ جہاں دامن سوال دراز کروں۔ تو ہی میری مدد فرما۔

نماز کا چھٹا عمل "جلسہ" اور اس کے بعد پھر "سجدہ" ہے۔

جب سجدہ اولیٰ کے ذریعے ذات حق اعانت اور عطا کے ارادے سے اپنے بندے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تو بندہ جلسہ کے بعد پھر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو

جاتا ہے اور اس ذات سے وہ کچھ مانگتا ہے جس کی اسے طلب ہوتی ہے۔ سورہ فاتحہ میں عبادت واستعانت کے بعد "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ گویا انسان اس مرتبہ اپنے رب کریم سے ہدایت کی دولت مانگتا ہے کہ سب سے زیادہ جس شے کی مجھے حاجت ہے وہ تیری "ہدایت" ہے۔ اس لیے مجھے اس دولت سے مالا مال فرمادے۔

نماز کا ساتواں عمل "قعدہ اخیرہ" ہے۔ جس کا اختتام تسلیم یعنی "خروج عن الصلوٰۃ" پر ہوتا ہے۔ آخری سجدے سے اٹھ کر انسان پھر سکون کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ یہ اس کی نماز کا آخری عمل ہے۔ آخر میں سکون کے ساتھ رانوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا انتظار کی علامت ہے کہ جو کچھ خدا کی بارگاہ سے مانگا تھا۔ اب اس کے ملنے کی امید ہے۔ سائل تمام اعمال صلوٰۃ سے فارغ ہو کر اب اپنے آقا و مولیٰ کے دروازے پر منتظر بیٹھا ہے کہ کب اس کی بارگاہ رحمت پناہ کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ عطاؤں سے نوازا جاتا ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ کی چھٹی آیت صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے۔ جس میں خدا کی نعمت نصیب ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا جا رہا ہے یعنی اے بندے! جو کچھ تو نے مجھ سے مانگا تھا۔ اب اس نعمت کو پانے کے لیے تیار ہو جا۔ جس طرح نماز کا اختتام دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ کا اختتام بھی گمراہ اور مغضوب و مقہور لوگوں سے لاتعلقی کے اظہار پر ہوتا ہے۔ لہٰذا سورہ فاتحہ نماز کے جملہ اعمال کی روح ہے اور اس کی سات آیات نماز میں عبادت کا صحیح تصوراتی ضابطہ مہیا کرتی ہیں۔

سورہ فاتحہ اور ضابطہ استعانت

سورہ فاتحہ میں ضابطہ عبادت کے بعد ضابطہ استعانت مہیا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے الفاظ پر مشتمل چوتھی آیت ملاحظہ ہو۔ جس کا معنی ہے۔ "اے باری تعالیٰ! ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔

یہاں عبادت کو استعانت پر مقدم رکھا گیا ہے حالانکہ بادی النظر میں استعانت' عبادت پر مقدم ہوتی ہے۔ اگر باری تعالٰی کی مدد شامل حال نہ ہو تو انسان کو توفیق عبادت ہی نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ انسان پہلے بارگاہ ایزدی میں التجا کر کے عبادت و اطاعت کی توفیق و اعانت طلب کرتا تاکہ وہ حق بندگی ادا کر سکتا۔ لیکن جب ہم سورہ فاتحہ کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں پہلے عبادت کا ذکر ہے اور بعد میں استعانت کا۔ فی الحقیقت یہی ضابطہ استعانت ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ آیت بندے اور خدا کے درمیان دو جہتی تعلق کو بیان کرتی ہے۔ اسی کے حوالے سے دو حقوق بھی بیان کیے گئے ہیں:۔

۱۔ حق الوہیت (باری تعالٰی کا حق)

۲۔ حق عبودیت (بندے کا حق)

خدا کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اس حق کی ادائیگی بندے کے ذمہ لازم ہے اور بندے کا حق یہ ہے کہ اس کی مدد و اعانت کی جائے۔ اس حق کی ادائیگی خدا کے ذمہ کرم پر لازم ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالٰی ہے:۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ — ہمارے اوپر مومنوں کی مدد کرنا لازم ہے۔

(الروم '۳۰: ۴۷)

جب یہ واضح ہو گیا کہ عبادت' باری تعالٰی کا حق ہے اور اعانت بندے کا' تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ بندے کا حق' خدا کے حق پر مقدم کیا جاتا۔ سورہ فاتحہ خدا سے مدد طلب کرنے اور اس کی اعانت کا صحیح حقدار بننے کا سلیقہ و ضابطہ یہ بیان کر رہی ہے کہ "اے انسان! تو غلام ہے اور تیرا کام اپنے آقا و مولٰی کی اطاعت و عبادت کرنا ہے۔ اگر تو اس کی بندگی کا حق ادا کر دے اور اس کے بعد اس سے کچھ مانگے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ذات تیرا حق ادا نہ کرے۔ جب بندہ خدا کا حق ادا کر کے اس سے اپنا حق طلب کرے تو اس ذات کی سخاوت و کریمی اور غیرت عطاء بخشش جوش میں آ جاتی ہے اور اس پر اپنی نوازشات کے دروازے کھول دیتی ہے کیونکہ مزدور جب محنت کے بعد اپنا حق مانگتا ہے

تو اسے پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کا حق ادا کر دیا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں سب سے پہلے انسان اپنی زبان سے اس کی خوبی و کمال اور ربوبیت عامہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کی بے پایاں رحمتوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ پھر اس کی شان مالکیت کا بیان کرتا ہے۔ بعد ازاں اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں سرنیاز خم کر دیتا ہے تاکہ بندہ و غلام ہونے کے اعتبار سے اس کا حق ادا ہو سکے۔ اس کے بعد اسے تعلیم دی جا رہی ہے کہ اب اسکی بارگاہ میں اپنا دامن طلب دراز کر اور دیکھ تو اس کی عنایات سے کس طرح نوازا جاتا ہے۔ جب بندہ خدا کی طرف بڑھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا اپنے بندے کی طرف نہ بڑھے۔ حدیث مبارک میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی بندہ اس کی طرف ایک قدم اٹھائے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر (۷۰) قدم آگے بڑھتا ہے۔ جو ذات ایک قدم کے مقابلے میں ستر قدم آگے بڑھے وہ بندے کی عبادت گزاری کے بعد گریہ و زاری اور عجز و انکساری کے ساتھ مانگی ہوئی مراد کیوں عطا نہ کرے گی۔

سورہ فاتحہ کا یہ اسلوب درحقیقت انسانوں کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ تم بندے ہو۔ تمہیں اپنی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارا کام اپنے آقا و مالک کو منانا ہے۔ اس کی رضا و خوشنودی کا حصول ہے۔ اس کی عبادت و اطاعت ہے۔ اس کے حق کی ادائیگی ہے۔ اگر تم اپنے مالک کی رضا کے لیے کوشاں رہو۔ اس کے احکام کی اطاعت میں مگن رہو اور اس کے حضور سرنیاز جھکاتے رہو تو وہ ذات از خود تمہارے کام سرانجام دیتی رہے گی۔ وہ تمہاری خاطر کائنات کو مسخر کر دے گی۔ تم اس کے ہو جاؤ گے تو وہ تمہاری ہو جائے گی۔ اس لیے عبادت کو استعانت پر مقدم کر کے انسان کو اس طرف متوجہ کیا گیا کہ اے بندے! تو اپنی بہتری کو کیا جانے گا اور کیا مانگے گا تو اس کی بندگی میں لگا رہ' تیری بہتری تجھ سے زیادہ اس کو معلوم بھی ہے اور مقصود بھی۔ چنانچہ تو اس کی عبادت کر اور اس کی مدد کا طلب گار رہ' وہ ذات از خود تجھے اپنی نعمتوں سے بہرہ ور کر دے گی۔ یہ ضابطہ استعانت ہے۔ لیکن آج کا انسان اس حقیقت سے بے خبر ہے۔ وہ حق الوہیت ادا کیے بغیر خدا سے اپنا حق مانگتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ بندگی میں کامل ہو جائے

تاکہ وہ خدا کی طرف سے کامل اعانت کا مستحق قرار دیا جاسکے۔ اس لیے قرآن مجید میں مذکور ہے:

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ   صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو۔

(البقرہ' ۲: ۱۵۳)

صبر' مشکلات و مصائب پر خوش رہنے کا نام ہے اور صلوٰۃ اس کا شکر بجالانے کا۔ "صبر و صلوٰۃ" درحقیقت بندگی کا امتحان ہے کہ بندے پر کوئی مشکل وقت آجائے تو کیا اس وقت بھی اپنے آقا و مالک سے خوش رہتا اور اس کا شکر بجالاتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ تکلیف و اذیت کے دوران بھی اپنے مالک سے خوش ہے اور زبان پر کلمہ تشکر لاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسکی نظر ظاہری احوال و کیفیات پر نہیں بلکہ اپنے مالک کی رضا پر ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے مالک کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ خواہ اسے ظاہراً دکھ ہو یا سکھ' تکلیف ہو یا راحت۔ لہذا "صبر و صلوٰۃ" فی الواقع بندے کی بندگی کی آزمائش ہے۔ کیونکہ صبر' شکوے سے زبان کو روکتا ہے اور صلوٰۃ شکر کے لیے زبان کو کھولتی ہے۔ اگر بندہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے تو وہ خدا کی خصوصی عنایات و نوازشات کا حق دار ہو جاتا ہے۔ مدد کو "صبر و صلوٰۃ" کے ساتھ مختص کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ:-

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا   بیشک تنگی کی ساتھ ہی راحت نصیب ہوتی ہے۔

(الم نشرح' ۹۴: ۶)

جب تک سونا بھٹی میں پگھلنے کے مرحلے سے نہ گزر جائے اپنی اصل قدر و قیمت کو نہیں پا سکتا۔ اسی طرح جب تک بندہ مصائب و مشکلات کے سمندر سے "صبر و صلوٰۃ" کی کشتی پر سوار ہو کر گزر نہ لے وہ ساحل مراد کو نہیں پا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ نے بارگاہ ایزدی سے اعانت طلب کرنے کا یہ سلیقہ سکھایا کہ بندہ اس کی بندگی میں مصروف رہے۔ خواہ اس پر مشکل وقت کیوں نہ آجائے۔ اس کے نتیجے میں اس پر اعانت الٰہی کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور جو جو کچھ مانگے گا۔ جناب الٰہی سے بلا تاخیر پائے گا۔

سورہ فاتحہ اور ضابطہ طلب ہدایت

عبادت اور استعانت کے بعد سورہ فاتحہ نے تیسرا ضابطہ طلب ہدایت کا بیان کیا ہے۔ جس کا استنباط "**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ**" کی دعا سے ہوتا ہے۔

یہاں کلام کا انداز دفعتہً دعائیہ ہو گیا ہے۔ دعا یہ ہے کہ انسان اپنے وسائل و ذرائع اور اسباب پر بھروسہ کرنے کے بجائے باری تعالیٰ کے دامن رحمت پر بھروسہ کرتا ہے۔ یہاں بھی طلب ہدایت کے لیے انسان کو باری تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹانے کی تلقین کی گئی ہے۔ حالانکہ ہدایت کی کئی استعدادیں انسان کے اندر بھی خلقی اور طبعی طور پر ودیعت کی گئی ہیں۔

فطری ہدایت------ جو انسان کو جبلی طور پر پیدائش کے وقت سے میسر ہوتی ہے۔

حسی ہدایت------- جو انسان کو حواس خمسہ کے ذریعے نصیب ہوتی ہے۔

عقلی ہدایت------- جو انسان کو عقل کی بنا پر غور و فکر سے نصیب ہوتی ہے۔

وجدانی ہدایت------ جو انسان کو صفائے قلب کے باعث روحانی طور پر نصیب ہوتی ہے۔

لیکن یہ سب ہدایتیں ظنی ہیں۔ ان میں احتمال خطا موجود رہتا ہے۔ ان میں سے کوئی استعداد ایسی نہیں جو انسان کو حقیقت کا یقینی علم عطا کر دے۔ ان سب وسائل کے ہوتے ہوئے سورہ فاتحہ انسان کو بارگاہ ایزدی سے ہدایت کا سوال کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسان اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے کہ سب انسانی استعدادیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی' وہ منزل کا سراغ تو دے سکتی ہیں لیکن منزل مقصود تک پہنچا نہیں سکتیں۔ اگر منزل مقصود تک پہنچنا درکار ہو تو وہ صرف ہدایت ربانی سے ہی ممکن ہو گا۔ جو عقل و خرد کی کاوشوں سے نہیں بلکہ غلامی رسول ﷺ سے نصیب ہوتی ہے۔ بقول شخصے:۔

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفٰے

اسی لیے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:-

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

وہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

جب انسان اپنے نتائج فکر کو حتمی سمجھنے کے بجائے ہدایت ایزدی کے فیصلے کو حتمی و قطعی سمجھنے لگے اور ہدایت ایزدی کا فیصلہ بھی خدا کے انعام یافتہ بندوں سے دریافت کرے یا انکی اتباع سے حاصل کرے تو پھر اس کے گمراہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی عقل کا فیصلہ "ظن" ہے اور ہدایت ربانی کا فیصلہ "حق"۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:-

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا (النجم، ۲۸:۵۳)

بیشک ظن، حق کی جگہ ذرہ بھر فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ (یعنی ظن بالکل حق کی جگہ نہیں لے سکتا)۔

جس سے واضح ہو گیا کہ ظنی علم، کسی لحاظ سے بھی یقینی علم کا بدل نہیں ہو سکتا۔ باری تعالیٰ سے اس یقینی ہدایت کو حاصل کرنے کا جو سلیقہ اور ضابطہ سورہ فاتحہ نے مہیا کیا ہے وہ "انعام یافتہ بندوں کی پیروی" ہے۔ جیساکہ ارشاد فرمایا گیا:-

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ (الفاتحہ، ۱:۷)

یہ راہ ہدایت ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اے باری تعالیٰ! تو نے انعام فرمایا۔

راہ ہدایت تو فی الحقیقت قرآن و سنت کی راہ ہے کیونکہ ارشاد فرمایا گیا:-

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡهُ (الانعام، ۶:۱۵۳)

بیشک میرا یہ راستہ سیدھا راستہ ہے۔ پس اس کی پیروی کرو۔

حضور ﷺ کے بارے میں قرآن مجید میں اعلان کیا گیا:-

اِنَّکَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ

بے شک اے نبی! آپ سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔ جو راہ اس اللہ

مَافِی الْاَرْضِ — کی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کا
(الشوریٰ، ۴۲: ۵۲، ۵۳) — سب کچھ ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر ارشاد فرمایا گیا:۔

وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ — نبی ﷺ کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا
(الاعراف '۷: ۱۵۸) — جاؤ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن و سنت ہی کی راہ وہ راہ ہے جسے "صراط مستقیم" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سورہ فاتحہ نے "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" "کا بدل" صراط القرآن والسنہ کو قرار نہیں دیا بلکہ کہا:۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ — ان کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔

اس تقدیم پر مفہوم عبارت یہ ہوا:۔

اهدنا صراط من انعمت عليهم من المتقدمين (التفسیر الکبیر، ۱: ۲۵۶) — اے باری تعالیٰ! ہمیں اس راہ کی ہدایت عطا کر جو تیرے انعام یافتہ بندوں کی ہے۔

گویا سورہ فاتحہ نے ہدایت ربانی اور علم یقینی کے لئے اس راستے کو طلب کرنے کی تلقین کی ہے جو خدا کے مقبول اور صالح بندوں کی راہ ہے۔

اس آیت کے مدعا کا قرآن و سنت کی راہ سے کوئی تخالف یا تضاد نہیں بلکہ فی الواقع دونوں تصورات میں مطابقت ہے۔ وہ یوں کہ "حقیقت میں صراط مستقیم تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہی راستہ ہے لیکن اس امر کا تعین کس طرح ہو گا کہ کونسا راستہ صحیح معنوں میں خدا اور رسول یعنی قرآن و سنت کا راستہ ہے؟ کیونکہ ہر داعی' ہر مفکر اور ہر مبلغ اپنے راستے کو قرآن و سنت کا ہی راستہ قرار دیتا ہے۔ اس الجھن کا قطعی حل اور اس امر کا حتمی تعین سورہ فاتحہ نے مہیا کر دیا کہ قرآن و سنت کی وہ راہ' جو صحیح معنوں میں صراط مستقیم ہے وہی ہے' جس پر صلحاء و مقبولین اور اولیاء کاملین چلتے رہے ہیں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے بڑھ کر خدا کے انعام یافتہ بندے یہی ہیں۔

ان کے راستے کو چھوڑ کر قرآن و سنت کے نام پر الگ راستے کی تلاش کرنا صریح گمراہی و ضلالت ہے۔ یہ فکر خدا کے قہر و غضب کو دعوت دینے اور قرآن کی تعلیمات سے کھلی بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں کے چار طبقات بیان کیے ہیں۔

انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ جیسا کہ "سورہ النساء ۶۹" سے ثابت ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بھی طبقے کا راستہ دوسرے طبقے سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ اگر صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے کسی کی راہ انبیاء کرام علیہم السلام کی راہ سے جدا ہو اور ان کی تعلیمات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے مختلف ہوں تو وہ کسی صورت میں انعام یافتہ نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ قرآن مجید نے ان سب کو "انعام یافتہ بندوں" کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ اس تصریح سے یہ ثابت ہو گیا کہ صلحاء امت کی راہ اور ان کی تعلیمات کو تعلیمات نبوی ﷺ سے جدا سمجھنا یا انہیں قرآن و سنت کی تعلیمات سے مختلف تصور کرنا کھلی جہالت اور گمراہی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ جس کو ہم قرآن و سنت کی راہ سمجھ رہے ہیں اور اس راہ کو صلحاء امت کی راہ سے مختلف پا رہے ہیں۔ اس میں ہمارے فہم کی خطا ہو۔ ہم نے قرآن اور سنت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اس وجہ سے ہمیں قرآن و سنت کے احکام اور صلحاء امت کی تعلیمات میں اختلاف دکھائی دے رہا ہو، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بارگاہ ایزدی کے صلحاء و مقبولین قرآن و سنت کی راہ سے الگ راہ پر بھی چلتے رہے ہوں اور پھر بھی بارگاہ ایزدی میں صالحیت و قبولیت کے درجے پر فائز ہوں۔ لہٰذا طلب ہدایت کا قرآنی ضابطہ یہ ہے کہ ہدایت تو فی الواقع قرآن و سنت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اس ہدایت کو صحیح طور پر اخذ کرنے کے لیے صلحاء امت کے راستے کی پیروی ضروری ہے۔ اس کے بغیر شیطان قرآن و سنت کے نام پر گمراہیوں کے کئی جال پھیلائے ہوئے ہے۔

سورہ فاتحہ اور ضابطۂ طلب استقامت

طلب ہدایت کے بعد طلب استقامت کا ضابطہ بھی سورہ فاتحہ نے ہی مہیا کیا

ہے۔ انعام یافتہ بندوں کی معیت و پیروی' ہدایت کی راہ تھی۔ مغضوب اور گمراہ لوگوں سے لاتعلقی' عدم رفاقت اور ان کی صحبت سے اجتناب' استقامت کی راہ ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے اس مقام پر صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے الفاظ پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد ضابطہ طلب استقامت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ (الفاتحہ' ۱:۷)	ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہدایت میسر آجانے سے بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد اس ہدایت پر ثابت قدم رہنا اس سے بھی نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ جسے دولت ہدایت نصیب ہو جاتی ہے شیطان بھی اس پر شدید تر حملے کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ کیونکہ ڈاکہ دولت مند پر ہی ڈالا جاتا ہے۔ جس کے پاس سرے سے سرمایہ و دولت ہی نہ ہو اس پر حملہ کرنے کی آرزو کون کرے گا۔ اس لیے ہدایت کے بعد استقامت ضروری مرحلہ ہے۔ قرآن حکیم صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ استقامت کی بھی راہ دکھلاتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل' ۹:۱۷)	بے شک یہ قرآن اس راہ کی راہنمائی کرتا ہے جو سب سے بڑھ کر سیدھی ہے۔

لہٰذا قرآنی راہ ہدایت تو یہ بھی تھی کہ خدا کے نیک بندوں سے وابستہ رہو تاکہ تمہیں راہ حق نصیب ہو سکے۔ قرآنی راہ استقامت یہ ہے کہ گمراہوں سے بچے رہو اور بدبختوں سے دور رہو تاکہ حق میں ثابت قدم رہ سکو۔ جس طرح نیکوں کی صحبت سے دولت ہدایت میسر آتی ہے۔ اسی طرح بروں کی صحبت کے باعث ہدایت سے محرومی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ہدایت و استقامت کی دونوں شرائط بیان کر دیں۔ اگر ہدایت چاہتے ہو تو ہدایت یافتہ لوگوں کے قریب رہو اور استقامت چاہتے ہو تو گمراہوں سے دور رہو۔ کیونکہ وہ طرح طرح کے شبہات ذہنوں میں ڈال کر اعتماد میں تزلزل پیدا

کر دیں گے اور اس طرح ہدایت سے محرومی واقع ہو جائے گی۔ احادیث مبارکہ میں وارد ہوا ہے کہ نیکوں کے قریب ہونا خود نیکی کے حصول کا باعث ہوتا ہے۔

ما احب عبد عبداللہ الا اکرمہ (مسند احمد بن حنبل) — جب بھی کوئی بندہ اللہ کے لیے کسی دوسرے سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بہرصورت نیکی اور بزرگی سے نواز دیتا ہے۔

ایک مقام پر حضور علیہ السلام نے نیک لوگوں کی علامت کے طور پر بیان فرمایا:۔

خیارکم الذین اذارؤوا ذکر اللہ (ابن ماجہ، ۳۰۳) — تم میں سے نیک اور بزرگ لوگ وہ ہیں جنہیں دیکھتے ہی اللہ یاد آجائے۔

جن مقبولان الٰہی کی زیارت ہی خدا کی یاد کا باعث ہو تو ان کی صحبت ہدایت کا باعث کیوں نہ ہو گی۔ ایسے اخیار امت کی صحبت و محبت نہ صرف اس دنیا میں ہدایت و منفعت کا باعث ہو گی بلکہ آخرت میں بھی ابدی منفعت کا سامان فراہم کرے گی۔ جیساکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ یقول یوم القیمہ این المتحابون بجلالی الیوم اظلھم فی ظلی یوم لا ظل الا ظلی (صحیح المسلم، ۲۱۷،۳) — قیامت کے دن باری تعالیٰ فرمائیں گے۔ میری تعظیم کی خاطر آپس میں محبت کرنے والے لوگ کہاں ہیں آج میں انہیں اپنے سائے میں چھپالوں۔ جس دن میرے سائے کے سوا اور کوئی سایہ نہیں ہے۔

چنانچہ نیک لوگوں سے خدا کے لیے محبت و مصاحبت روز قیامت بھی باعث سعادت و نجات ہو گی۔ جس طرح خدا کے انعام یافتہ بندوں سے تعلق و مصاحبت اور ان کی اطاعت و اتباع سعادت کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح گمراہ اور غضب یافتہ بندوں

سے تعلق و مصاحبت اور ان کی اتباع شقاوت و بدبختی کا باعث بنتی ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں صلحاء سے حقیقی تعلق ہدایت کا سبب اور گمراہوں سے دوری استقامت کا سبب قرار دی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ اور ضابطہ طلب نعمت

جب انسان حالت نماز میں کھڑا ہو کر ذکر الٰہی کرتا ہے اور سورہ فاتحہ کی تلاوت میں مشغول ہوتا ہے تو اس پر خدا کی نعمتوں کے سب دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ جنت جو باری تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا مرکز ہے' کے آٹھ (۸) دروازے ہیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

باب المعرفت' باب الذکر' باب الشکر' باب الرجاء' باب الخوف' باب الاخلاص' باب الدعاء' باب الاقتداء (کما فی التفسیر الکبیر)

۱۔ جب انسان نماز میں داخل ہو کر **سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ** کے الفاظ میں باری تعالیٰ کی ثناء کرتا ہے اور اس کی عظمت اور تقدیس و تہلیل بیان کرتا ہے تو وہ خزانہ ربانی سے معرفت الٰہی کا حصہ پانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس پر جنت کا پہلا دروازہ "باب المعرفہ" کھول دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ نعمت معرفت سے نوازا جاتا ہے۔

۲۔ جب وہ **بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم** کے کلمات پر پہنچتا ہے تو ان کی برکت سے اس پر جنت کا دوسرا دروازہ "باب الذکر" کھول دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بسم اللہ' باری تعالیٰ کا اعلیٰ ذکر ہے۔

۳۔ اس کے بعد وہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** کہتا ہے۔ ان کلمات کے ذریعے باری تعالیٰ کا شکر بجالایا جارہا ہے جس پر جنت کا تیسرا دروازہ "باب الشکر" کھلتا ہے اور اسے شکر کی نعمتوں سے نوازدیا جاتا ہے۔

۴۔ اس کے بعد وہ **الرحمن الرحیم** کہتا ہے۔ یہ خدا کی رحمت کا ذکر ہے اور رحمت ہی کی بنا پر کسی سے امید وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر جنت کا چوتھا دروازہ "باب الرجاء"

(امید کا دروزہ) کھول دیا جاتا ہے اور وہ امید و رجا کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے۔

۵۔ اس کے بعد وہ **مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** کہتا ہے۔ یہ خدا کی مالکیت، بادشاہی اور سلطنت و ہیبت کا ذکر ہے۔ جس سے انسان پر خوف طاری ہوتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر جنت کا پانچواں دروازہ "باب الخوف" کھلتا ہے اور انسان خوف الٰہی کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازا جاتا ہے۔

۶۔ اسکے بعد وہ **اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** کہتا ہے۔ اس میں عبادت و استعانت کا اخلاص مذکور ہے۔ چنانچہ اس پر جنت کا چھٹا دروازہ "باب الاخلاص" کھول دیا جاتا ہے۔ جس کے ذریعے اسے عبودیت اور ربوبیت کی معرفت میں اخلاص نصیب ہو جاتا ہے۔

۷۔ اس کے بعد وہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** کہتا ہے تو اس پر جنت کا ساتواں دروازہ "باب الدعا" کھل جاتا ہے۔ جس سے وہ دعا کی نعمتوں اور برکتوں سے نوازا جاتا ہے۔

۸۔ جب وہ آخر میں "**صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" کہتا ہے تو اس پر جنت کا آٹھواں دروازہ "باب الاقتداء" کھل جاتا ہے۔ جس کے باعث وہ صلحاء و اولیاء کی نیک روحوں کی اقتداء میں علیین کے اعلیٰ مقامات میں داخل ہوتا ہے۔ جس کی طرف اس آیت کریمہ میں ارشاد ہے:۔

يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○

(الفجر، ۸۹: ۲۷۔۳۰)

اے نفس مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس پر راضی ہو اور وہ تجھ پر، پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں سما جا۔

اگر سورہ فاتحہ کی جملہ آیات کو مذکورہ بالا نعمتوں اور جنت کے مذکورہ بالا دروازوں سے متعلق سمجھ کر پڑھا جائے تو عنایات ایزدی کے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں اور انسان صحیح معنوں میں سورہ فاتحہ کی برکات و تاثیرات کا حامل قرار پاتا ہے۔

باب-۱۲

سورہ فاتحہ بطور اجمال قرآن

سورہ فاتحہ بطور اجمال قرآن

قرآن مجید دین حق کے تمام بنیادی مقاصد اور مطالب کی تفصیلات مہیا کرتا ہے اور سورہ فاتحہ اس تفصیل کا اجمال ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر تفصیل کے لیے اجمال کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اجمال کے ذریعے اس تفصیل کا سرسری مگر جامع اور مانع جائزہ لیا جا سکے۔ گویا یہ سورت قرآن حکیم کے مفصل بیان کا خلاصہ ہے۔ جو کچھ باری تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے عالم انسانیت کو عطا کیا ہے۔ اس کے اہم نکات اور اساسی مطالب سارے کے سارے اختصار کے ساتھ سورہ فاتحہ میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ قرآن حکیم کھولتے ہی جب قاری کی نظر سورہ فاتحہ پر پڑے تو اس کے مطالعہ سے اس کے جملہ مضامین کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور وہ معارف قرآن کی عظمت کا بنیادی تصور شروع سے ہی ذہن میں لے کر ان کی تفصیلات کی جستجو کے لیے آگے بڑھے۔

مفصل مضمون سے پہلے اسکی تلخیص اور اجمالی خاکہ پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے مضمون کے مندرجات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس سے تفصیلات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر یہ احسان عظیم فرمایا ہے کہ معارف قرآن کے بے کنار سمندر کو خود ہی بصورت "فاتحہ" کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اگر ایسا اہتمام نہ کیا جاتا تو قرآن کا اس قدر جامع اور موجز خلاصہ انسانی کاوش سے کبھی بھی تیار نہ ہو سکتا۔ اس طرح بیشمار ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے افراد جو پورا قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ مطالب قرآن کے فہم سے ناآشنا رہتے اور یہ روشنی ہر ایک تک نہ پہنچ سکتی۔ باری تعالیٰ نے چاہا کہ ایک ایسی سورت ہو جو قرآن مجید کے جملہ اسرار و رموز اور غوامض و مطالب بلکہ دین حق کے تمام بنیادی مقاصد آسان اور عام فہم انداز میں بیان کرے اور قرآن کی تمام برکات و تاثیرات کو

[illegible] اس میں [illegible] ہو [illegible] کی عبارت اتنی مختصر ہو کہ [illegible] آسانی سے یاد کر سکیں۔ اسے بطور اجمال قرآن، اس مقدس کتاب کے آغاز میں وارد کیا جائے تاکہ ہر خاص و عام اس کے ذریعے قرآن و اسلام کی ضروری حد تک معرفت حاصل کر سکے اور خود کو ان کی برکات و تاثیرات سے متمتع بھی کر سکے۔ اسلام کا ابدی پیغام چونکہ ہر شخص کے لیے تھا۔ اس لیے یہ بات ہرگز ممکن نہ ہو سکتی تھی کہ صرف پڑھے لکھے افراد ہی قرآنی تعلیمات سے حصہ پائیں اور ان پڑھ، کم پڑھے لکھے یا سادہ لوح افراد، جن کی تعداد انسانی معاشروں میں ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ فیوض قرآنی سے کلیتاً محروم رہ جائیں۔ لہٰذا عام لوگوں کو کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود علوم و معارف کے اس عظیم سمندر سے اسی صورت میں حصہ مل سکتا تھا کہ ایک سورت کو نہایت آسان، مختصر اور جامع انداز میں مرتب فرما کر نازل کیا جاتا جسے ایک ان پڑھ شخص یاد بھی کر سکتا اور اس کا معنی و مفہوم سمجھ بھی سکتا۔ مستزاد یہ کہ ایسا اہتمام بھی کیا جاتا کہ ہر مسلمان چار و ناچار اس سورت کو حفظ کرتا اور کسی نہ کسی صورت میں اسے بار بار پڑھتا رہتا۔ تاکہ قرآن کا سبق اجمالی طور پر ہر ایک کے سامنے ہوتا۔ یہ کام سورہ فاتحہ کے ذریعے لیا گیا۔ جسے چھوٹی چھوٹی سات آیات میں نہایت آسان اور عام فہم انداز میں اتارا گیا اور اسے حصہ نماز بنا کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ

لَا صَلٰوۃَ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب (سنن نسائی، ۱، ۱۴۵)	جس نے (نماز میں) فاتحہ نہیں پڑھی اسکی نماز نہیں ہوئی۔

چنانچہ ہر مسلمان خواہ جس خطہ زمین کا مکین ہو اور کچھ پڑھے یا نہ پڑھے وہ نماز کے طور پر یا علیحدہ سورہ فاتحہ ضرور پڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اس کو حفظ کرتے ہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کے آغاز سے انجام تک بلکہ اس کی موت کے بعد بھی سورہ فاتحہ کا تعلق کسی نہ کسی طرح انسان کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ یہ سورت زندگی میں انسان روزانہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مواقع پر اس کی تلاوت کرتا ہے اور مرجانے کے بعد دوسرے لوگ بھی اس کی خاطر یہی

سورت پڑھتے رہتے ہیں- چنانچہ یہ سلسلہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہتا ہے اور سورہ فاتحہ کا تعلق انسان سے کبھی بھی منقطع نہیں ہونے پاتا- اسی لیے قرآن مجید نے اس سورت کا نام "**سبعًا من المثاني**" رکھا ہے- جس کے معنی "بار بار پڑھی جانے والی سات آیات" کے ہیں- گویا نماز کے اندر اور اس کے باہر بار بار کثرت کے ساتھ پڑھی جانے والی سات آیات اسی سورت کی ہیں- یہ شرف کسی اور سورت کو نصیب نہیں ہو سکا-

"**السبع المثانی**" میں "**سبع**" کا لفظ جو پورے سات کے عدد کے لیے بولا جاتا ہے- اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ سورت جہاں بھی پڑھی جائے- جس وقت بھی پڑھی جائے مکمل ہی پڑھی جائے- ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اس کی سات آیتوں کو تقسیم کر دے جیسا کہ دوسری سورتوں میں سے کم از کم تین آیات ہر رکعت میں پڑھی جا سکتی ہیں- لیکن اس سورت کو دو رکعتوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا- حالانکہ عدد آیات کے لحاظ سے ایسا ممکن ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت کی خصوصی اہمیت محض سورت قرآن ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ قرآن مجید کا خلاصہ اور اجمال ہونے کی بناء پر ہے- اس لیے اسے تقسیم کر دینے سے مطالب قرآن کا مکمل مفہوم بیک وقت بیان نہیں ہو سکتا- چنانچہ شریعت نے یہ حکم دیا کہ ہر جگہ اسے پورا ہی پڑھا جائے تاکہ اس کا مکمل مضمون اول سے لے کر آخر تک ایک ہی وقت میں بیان ہو سکے- کیونکہ یہ پورے کلام الٰہی کا اجمالی تعارف ہے- اس کے اجمال قرآن ہونے کو اس سورت کے مختلف ناموں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے- مثلاً فاتحۃ الکتاب، ام القرآن، سورہ الکنز، سورہ الکافیہ، سورہ الوافیہ، وغیرہ- اگر سورت فاتحہ کے مضمون کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے قرآن حکیم کا خلاصہ و اجمال تین وجوہ کی بناء پر قرار دیا گیا ہے-

سورہ فاتحہ کے اجمال قرآن ہونے کی پہلی وجہ

یہ حقیقت ہے کہ پورا قرآن خدا کی معرفت اور اس کی بارگاہ تک رسائی حاصل کرنے کی تعلیم پر مشتمل ہے- قرآن مجید کی مرکزی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو اپنے

خالق و مالک کی پہچان ہو۔ اس سے اپنا رشتہ بندگی استوار کرے اور اس کی بارگاہ میں تقرب حاصل کر سکے تاکہ دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کا مستحق قرار پائے۔ اسی تعلیم کو تمام بنیادی تقاضوں کے حوالے سے سورہ فاتحہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر سورہ فاتحہ کا نفس مضمون اور آیات کا ترجمہ و مفہوم ترتیب کے ساتھ ذہن میں رکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری کائنات اللہ کی خلق، تدبیر اور تربیت کی آئینہ دار ہے۔ ہر طرف اس کی ربوبیت کے جلوے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اس کی رحمت کے بے پایاں مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اسکی عنایات و انعامات کا لامتناہی سلسلہ عالم وجود میں ہر طرف پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر اسکی مالکیت و بادشاہت نے عدل و انصاف اور انتقام کا ایک بھرپور نظام بپا کر رکھا ہے۔ جس کے باعث کسی کی نیکی اور بدی اپنے صحیح نتیجہ و انجام کو پائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب انسان موجودات کائنات کی کامل پرورش، ان پر رحمت و مہربانی اور عدل و انصاف کے بھرپور نظام کو ہر طرف دیکھتا ہے تو اس کی زبان بے ساختہ اس کائنات کے رب کی خوبی اور تعریف کے لیے کھل جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں شکر و امتنان کے جذبے سے جھک جاتی ہیں۔ خدا کی ربوبیت، رحمانیت و رحیمیت اور مالکیت کی نشانیوں کو دیکھ کر انسان کے دل میں خدا کے شکر اور اس کے اعتراف عظمت کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو میری اور اس ساری کائنات کی پرورش کر رہا ہے، جو ہم سب کو اپنی نوازشوں اور رحمتوں سے مالا مال کر رہا ہے، جو اپنی گرفت و قدرت کے ذریعے ہر نیک و بد کو اپنے انجام تک پہنچا کر نظام عدل قائم فرما رہا ہے میں اس کی عظمت اور احسان کے اعتراف کے طور پر سر نیاز اس کی بارگاہ میں خم کر دوں۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ جب کسی کو کسی دوسرے شخص کے احسان کا علم ہوتا ہے کہ اس نے میرے اوپر کتنی مہربانی کی ہے تو لامحالہ اسکا سارا وجود ہدیہ تشکر بن جاتا ہے۔ اسکے دل میں اپنے محسن کے لئے جذبات عقیدت جوش مارنے لگتے ہیں اسی طرح جب انسان کائنات میں ہر طرف اپنے خالق و مالک کے احسانات و انعامات کا غیر محدود سلسلہ دیکھتا ہے اور اپنے اوپر اپنے رب کی نوازشات بغیر کسی صلے

[illegible] محسوس کرتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ میں [illegible] اور [illegible]
کی بندگی کروں۔ جذبہ شکر کی اسی تحریک سے اس کی بارگاہ میں کمال خضوع کے ساتھ جھک جانا عبادت کہلاتا ہے یعنی شکر کا جذبہ بندے کو اپنے رب کی عبادت پر اکساتا ہے پھر یہی عبادت استعانت کے لئے زور دار محرک بن جاتی ہے۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ جب میرا پروردگار اللہ ہے اور میں عبادت بھی اسی کی کرتا ہوں تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں جملہ امور میں دامن سوال اس کے آگے دراز نہ کروں؟ لہذا انسان ہر مشکل وقت میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ خدا کی ہستی' اس کی ربوبیت و رحمانیت اور اس کی بادشاہت کی خبر پا کر جب انسان اس کے آگے جھکتا ہے اور اس سے مدد چاہتا ہے تو یہاں پہنچ کر اس کے دل میں ایک امنگ پیدا ہوتی ہے کہ میں جس رب کائنات کے سامنے اپنی جبین نیاز جھکا رہا ہوں' جس کے سامنے اپنا دامن طلب دراز کر رہا ہوں آخر اس تک پہنچنے کی راہ کیا ہے؟ وہ کونسا طریقہ ہے جو مجھے اس کے قریب کر دے؟ اس کو پانے اور اس کا مقبول بندہ ہونے کا اصول کیا ہے؟ اس کی عبادت کا صحیح سلیقہ کیا ہے؟ اس سے مانگنے کا ڈھب کیا ہے؟ وہ کونسا راستہ ہے جس پر چلنے سے وہ راضی ہو گا؟ اور وہ کونسا راستہ ہے جس پر چلنے سے وہ غضبناک ہو گا؟ یہاں انسان اپنی نفسی اور طبعی استعدادوں کی طرف متوجہ ہوا کہ شاید ان سے ہدایت مل جائے' سب سے پہلے انسان نے اپنی جبلی استعداد سے سوال کیا کہ خدا کو پانے کا راستہ کیا ہے؟ لیکن جبلی ہدایت نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کر دی کہ میری پرواز اس حد سے آگے ممکن نہیں۔ پھر انسان حواس خمسہ کی طرف متوجہ ہوا لیکن حسی ہدایت نے بھی کوئی راہنمائی نہ کی اور یہ جواب دیا کہ جو ہستی میرے ادراک سے ماوراء ہے میں اس کی طرف صحیح راہنمائی کیسے کر سکتی ہوں۔ پھر انسان نے عقل و خرد کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن عقلی ہدایت نے یہ کہہ کر کہ میں چراغ راہ ہوں' منزل نہیں ہوں خاموش ہو گئی۔ انسان نے وجدانی و روحانی استعداد کا دامن بھی تھاما لیکن وہ بھی یقینی و قطعی علم مہیا نہ کر سکی۔ یہاں انسان ورطہ حیرت میں گم تھا' پریشان و مضطرب تھا اور زبان حال سے پکار رہا تھا کہ میری نفسی صلاحیتیں اور

استعدادیں مجھے منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکیں۔ اب کوئی ایسا سامان عالم غیب سے پیدا ہو جو مجھے یقین کے ساتھ راہ حق سے آشنا کردے، جو میرا بازو تھام کر منزل مقصود تک پہنچادے، جس کے دامن سے منسلک ہو کر بارگاہ ایزدی کی معرفت پا سکوں اور مجھے اس تک پہنچنے کی صحیح صورت نصیب ہو جائے۔ جب انسان نے اس مقام پر اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا تو عالم امر سے ندا آئی کہ اب بارگاہ رب العزت سے ہی سوال کر کہ تجھے راہ حق نصیب ہو چنانچہ انسان حکم الٰہی کے مطابق پکار اٹھا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اے باری تعالیٰ! میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا ہوں، اب تو ہی مجھے اپنی راہ کی ہدایت عطا کر۔ اس پر جناب الٰہی سے جواب آیا، اے انسان! میں نے عالم انسانیت کو اپنی راہ اور اپنی بارگاہ تک پہنچانے کے لئے کائنات میں نبوت و رسالت کا نظام بپا کر رکھا ہے تو عقل و خرد کے تراشیدہ آستانوں کو چھوڑ کر آستانہ نبوی پر جھک جا۔ نبوی ہدایت کی روشنی سے ہی تجھے میری راہ مل جائے گی، مجھ تک پہنچنے کے لئے دامن نبوت سے وابستہ ہو جا، اپنی فکر کو فکر نبوت پر قربان کردے، اپنی سوچ کو تعلیم نبوت کے تابع کر دے، اپنے فیصلے کو قضاء نبوت کا غلام بنادے اور خود کو سلطنت نبوت کا محکوم کرلے، تجھے وہ متاع مل جائے گی جس کے لئے تو سرگرداں و پریشاں ہے۔ سورہ فاتحہ نے انسان کو خدا پرستی کا سلیقہ سکھانے کے لئے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی طرف راغب کیا چونکہ انعام یافتہ بندوں میں سے پہلا طبقہ گروہ انبیاء کا ہے۔ اس لئے طالبان ہدایت کے لئے سب سے پہلا اور اعلیٰ مرجع کاشانہ نبوت ہی قرار دیا گیا۔ اب انسان کے دل میں ایک اور سوال پیدا ہوا کہ کیا سلسلہ انبیاء ہمیشہ جاری رہے گا؟ کیا انبیاء کرام (علیہم السلام) انسانیت کی ہدایت کے لئے ہمیشہ مبعوث ہوتے رہیں گے؟ اس کا جواب بھی نفی میں تھا کہ سلسلہ نبوت، حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر ختم ہو جائے گا۔ ان کے بعد دنیا میں کسی نبی کی بعثت نہیں ہو گی لیکن ان کی ہدایت ابد الاباد تک باقی اور نتیجہ خیز رہے گی تاکہ امت نئی پیغمبرانہ بعثت سے بے نیاز رہے۔ ختم نبوت کے اس فیصلے کے پیش نظر قرآن نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے جواب میں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے جو الفاظ

منتخب فرمائے وہ اس قدر [illegible] انعام یافتہ بندوں [illegible] اصطلاح [illegible] قرآن نے دوسرے مقام پر چار طبقات کو شامل کر دیا تھا کہ "خدا کو پانے کی راہ انعام یافتہ بندوں کی راہ ہے اور انعام یافتہ بندوں میں انبیاء کرام کے علاوہ ان کے پیروکاروں میں سے صدیقین، شہداء اور صالحین بھی شامل ہیں۔" اس اصطلاح کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ذات مصطفوی ﷺ پر سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد انسان ہدایت سے محرومی کا اندیشہ نہ کرنے لگے بلکہ اسے معلوم ہو کہ نبی آخر الزماں ﷺ کے بعد ان کی عطا کردہ ہدایت ان کی امت کے صدیقین، شہداء اور صلحاء کے ذریعے ابد الاباد تک ملتی رہے گی، ان کی سنت اور تعلیمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، ان کی صحیح معرفت و صحیح تعین و تشخص بھی اہل دل و اہل نظر سے میسر آتا رہے گا۔ یہاں تینوں طبقات میں اہل علم و تحقیق کو اس لئے صراحتاً شامل نہیں کیا کیونکہ ان کے ہاں تحقیق اور علمی اختلاف کی گنجائش ہے جس سے عوام کو پریشانی لاحق ہو سکتی ہے لیکن اہل دل اور اہل نظر (یعنی امت کے صدیق، شہداء اور صالحین) کا مشرب چونکہ مشرب تسلیم ہے اس لئے وہاں فکری انتشار کا اندیشہ باقی نہیں رہتا چنانچہ طالبان ہدایت اور سالکان راہ حق کو یہی تعلیم دی جا رہی ہے کہ

گرد مستاں گرد، گر مے کم رسد، بوئے رسد
بوئے او گر کم رسد، رویت ایشاں بس است

پورا قرآن انسان کو راہ حق پرستی دکھانے کا علمبردار تھا اور اس میں اول سے آخر تک اسی کی تفصیلات مہیا کی گئی تھیں اس لئے سورہ فاتحہ نے اسی مضمون کو جامعیت کے ساتھ اپنے اندر بھی بیان کر دیا تاکہ وہ قرآنی تعلیمات کا ماحصل اور اجمال قرار پائے۔

سورہ فاتحہ کے اجمال قرآن ہونے کی دوسری وجہ

اگر قرآن مجید کے تمام مضامین کو سمیٹا جائے تو انہیں بنیادی طور پر تین عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: توحید، رسالت اور آخرت، ان کے علاوہ جو کچھ قرآن

مجید میں موجود ہے در حقیقت انہی تین عقائد کی تفصیل ہے۔ سورہ فاتحہ ان تین بنیادی عقائد کو اجمالاً بیان کرتی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں تمام خوبیوں اور تعریفوں کا حقیقی مستحق صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے جو پوری کائنات کا خالق اور پرودگار ہے۔ یہ بیان عقیدہ توحید پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرا عقیدہ رسالت ہے جس کا بیان الرحمٰن الرحیم کے ذریعے کیا گیا ہے۔ الرحمٰن الرحیم میں مخلوقات عالم پر باری تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا تذکرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذات رحمٰن و رحیم کی مختلف اقسام پر مشتمل بے شمار رحمتوں میں سے سب سے ارفع و اعلیٰ و اکمل و اتم رحمت نبوت و رسالت کا نظام ہے جس نے انسانوں کو توحید سے آشنا کر کے روز آخرت کی حاضری کے قابل بنایا لیکن نبوت و رسالت کا منتہائے کمال رسالت محمدی ﷺ ہے جو اول سے آخر تک تمام موجودات عالم کے لئے رحمت الٰہی کا واسطہ رہی ہے اور رہے گی بلکہ خود وجود مصطفوی ﷺ ہمیشہ سے ساری کائنات کے لئے سراسر رحمت ہے۔ کائنات و عوالم کے جس گوشہ کو بھی قدرت نے اپنے فیضان ربوبیت سے پالا ہے بلاشبہ وہی گوشہ وجود مصطفوی ﷺ کی رحمت سے مستفید و مستنیر ہو رہا ہے خواہ وہ وجود اور گوشہ عالم امر سے متعلق ہو یا عالم خلق سے، عالم ارواح سے متعلق ہو یا عالم شہادت سے، عالم برزخ سے متعلق ہو یا عالم آخرت سے، وجود مصطفوی ﷺ باری تعالیٰ کی ایسی رحمت ہے جو صرف خود ہی رحمت نہیں بلکہ زحمت کو بھی رحمت میں بدل دیتا ہے۔ مثلاً عذاب الٰہی، زحمت ہے جو فسق اور کفر پر متحقق ہوتی ہے لیکن کفر کے باوجود عذاب اٹھ جائے یا موخر ہو جائے تو یہ بلاشک و شبہ خدا کی رحمت ہے۔ باری تعالیٰ نے کفار و مشرکین اور فاسقین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ
(الانفال، ٨: ٣٣)

اللہ تعالیٰ اسے مناسب نہیں سمجھتے کہ لوگوں کو عذاب دیں درآنحالیکہ آپ ان میں موجود ہوں۔

گویا وجود مصطفوی ﷺ خلق خدا کے حق میں بلا استثنا باری تعالیٰ کی ایسی رحمت اور نعمت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے عذاب جیسی زحمت بھی مرتفع ہو جاتی ہے اور اس زحمت کی جگہ رحمت لے لیتی ہے چنانچہ یہ کہنا عین حق و صواب ہے کہ نبوت و رسالت کا نظام انسانیت پر خدائے رحمٰن و رحیم کی سب سے بڑی رحمت ہے لیکن اس رحمت کا نقطہ کمال ذات مصطفوی ﷺ ہے اس لئے اس ہستی کے مبعوث ہو جانے کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا- بلکہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد کسی نئے پیغمبر کی بعثت کی آرزو کرنا سب سے بڑھ کر کفران نعمت ہے کیونکہ جس طرح خدا کی رحمانیت و رحیمیت سے بڑھ کر رحمت کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا اسی طرح وجود مصطفوی ﷺ سے بڑھ کر کائنات میں خدا کی رحمانیت و رحیمیت کی کوئی تصویر نہیں ہو سکتی- یہی وجہ ہے کہ ذات حق نے بنی نوع انسان پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص بے شمار انعامات و احسانات کئے لیکن کبھی بھی کسی پر اپنا "احسان" نہ جتایا مگر نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا ذکر مومنوں پر احسان جتا کر کیا اور برملا یہ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران '۳:۱۶۴)	بے شک اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے رسول (حضرت محمد ﷺ) کو مبعوث کر دیا ہے-

قرآن مجید نے باری تعالیٰ کی ہزاروں رحمتوں اور نعمتوں کا ذکر کیا ہے لیکن کسی کا ذکر اس انداز سے نہیں کیا گیا جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود باری تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کے کارخانہ قدرت میں سب سے عظیم رحمت اور نعمت ذات مصطفوی ﷺ کی تھی جو اس نے کائنات کے دور آخر میں بنی نوع انسان اور دیگر مخلوقات کو عطا کر دی لہٰذا جب رحمٰن و رحیم کے اسماء' اللہ تعالیٰ کی تمام رحمتوں کے بیان پر حاوی ہیں تو یہ بالخصوص اس رحمت عظیم پر دلالت کیوں نہ کریں گے جس رحمت کو خود رب کائنات نے اپنا احسان عظیم قرار دیا ہے اس لئے "الرحمٰن الرحیم" سے نہ صرف نظام

بعثت و رسالت پر دلیل قائم ہوئی بلکہ یہ آیت بالخصوص رسالت محمدی ﷺ کا مبداء استدلال قرار پائی اور اسی نے ختم نبوت کا فلسفہ بھی واضح کر دیا۔

تیسرا عقیدہ **یوم آخرت** سے متعلق ہے جو قرآنی تعلیمات کا ماحصل ہے۔ سورہ فاتحہ نے بھی اسے **مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** کے الفاظ میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ہر شخص کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ آخرت کا وجود اور قیامت کا انعقاد حق ہے جس میں جزا و سزا کا حتمی انتظام کیا گیا ہے لہٰذا اس زندگی کے ہر عمل کا نتیجہ و انجام اخروی جزا کے لحاظ سے بھی متحقق ہو کر رہے گا۔ کوئی شخص اگر ظلم کا ارتکاب کر کے اس دنیا کی عدالت میں سزا پانے سے بچ گیا ہے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں چالاکی، عیاری، رشوت، سفارش اور دھوکہ دہی کے باعث کامیاب ہو گیا ہوں۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عنقریب اس کا معاملہ احکم الحاکمین کی عدالت میں پیش ہونے والا ہے جہاں ہر متنفس اپنے کئے کا بدلہ پا کر رہے گا۔

اسی طرح سورہ فاتحہ نے اپنی بقیہ آیات میں انہی تین عقائد کو دہرایا ہے۔ **اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** کے الفاظ خدا کی عبادت اور اس سے استعانت میں اخلاص، یکسوئی اور یکجہتی کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہی حالت عقیدہ توحید کی مقتضی ہے کہ نہ کوئی ذات الوہیت میں اس کا شریک ہو اور نہ کوئی صفات الوہیت میں۔ شرک دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے ذات میں یا صفات میں، عبادت میں اخلاص، توحید ذات ہے اور استعانت میں اخلاص توحید صفات ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہی آیت **شرك في الذات** کی بھی نفی کرتا ہے اور **شرك في الصفات** کی بھی۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ اپنے موقع پر آئے گی۔

اس کے بعد **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** میں جس نظام ہدایت کی طرف اشارہ ہے وہ صرف اور صرف واسطہ رسالت سے ہی میسر آتا ہے۔ اگر ہدایت، ذریعہ رسالت سے حاصل نہ ہوئی ہو تو نہ عقیدہ توحید کی حتمی اساس میسر آتی ہے اور نہ عقیدہ آخرت کی۔ وہ چیز جو خدا کے وجود کے اعتراف کو ایمان باللہ میں اور

اس کی وحدت کے اعتراف کو عقیدہ توحید میں بدلتی ہے وہ بھی تعلیم رسالت ہے۔ اس کے بغیر ہر چیز پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ سند ایمان کے طور پر "**لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**" کے دعویٰ کی صرف ایک ہی قطعی دلیل ہے اور وہ "**مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ**" ہے۔ اس دلیل سے صرف نظر کر کے دعوے کی صحت کا اعتراف نہیں کیا جا سکتا۔ آخر میں باری تعالیٰ نے اپنے انعام اور غضب دونوں معاملات کا ذکر کیا ہے۔ انعام اس کی جزا ہے اور غضب' سزا۔ اس لئے "**صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ** ○" حقیقت میں اس کے "**مالک یوم الدین**" ہونے کی وضاحت ہے کیونکہ جزا و سزا اور انعام و غضب الٰہی کا سب سے بڑا مقام یوم آخرت ہے گویا سورہ فاتحہ اول سے آخر تک انہی تعلیمات کے بیان پر مشتمل ہے جو سارے قرآن کا ماحصل ہیں۔ اس وجہ سے اسے اجمال قرآن قرار دیا گیا ہے۔

سورہ فاتحہ کے اجمال قرآن ہونے کی تیسری وجہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سورہ فاتحہ نے انسانوں کو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ایسا نظام فکر و عمل مہیا کیا ہے جس میں کسی لحاظ سے کوئی کمی نہیں۔ اگر **الحمد** سے **والناس** تک پورے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت منصہ شہود پر آتی ہے کہ قرآنی مطالب و تعلیمات کا منتہائے مقصود انسان کی اصلاح اور اس کی زندگی کو دنیا و آخرت میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنا ہے چنانچہ سارا قرآن اسی مضمون کی تفصیل پر مشتمل ہے لیکن سورہ فاتحہ کی سات آیات نے نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ اس پروگرام اور فکر و عمل کے قرآنی نظام کو اپنے اندر سمو دیا ہے جس کی وضاحت پہلے ایک مستقل عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔ وہ نظام فکر و عمل جو پورے قرآن حکیم کی تعلیمات کا نچوڑ اور لب لباب ہے' درج ذیل آٹھ نکات پر مشتمل ہے۔

صحت اعتقاد' اخلاص عمل' فکر احتساب و مسئولیت' منزل مقصود کا صحیح تعین'

جدو جہد میں عزم راسخ اور استقامت' کامیابی کا پختہ یقین اور اعتماد' اہل حق کی پہچان اور ان کی مصاحبت' اہل باطل کی پہچان اور ان سے عدم تعاون- یہ وہ بنیادی خاکہ ہے جس کی بنا پر اسلام کی ساری فکری اور نظریاتی عمارت قائم کی گئی ہے- اسی نظام فکر و عمل کو صحیح معنوں میں اپنا کر انسان دنیا و آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے-

یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر سورہ فاتحہ کو مضامین قرآن کا خلاصہ و اجمال تصور کیا جاتا ہے- سورہ فاتحہ کی اسی جامعیت کے باعث اسے قرآن کا دیباچہ یا باب اول ہونے کا شرف حاصل ہے- اگر انسان اس کی ایک ایک آیت کے معنی و مفہوم اور مقصد و مطلب پر غور کرے تو اسے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس سورۃ کے الفاظ و معانی کو بخوبی سمجھ لینے سے مطالب قرآن کا اصل لب لباب ضرور ذہن نشین ہو جاتا ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ جس نے سورۃ فاتحہ کو سمجھ لیا اس نے گویا پورے قرآن کی روح کو پا لیا-

باب-۱۳

سورہ فاتحہ
بطور تفصیل تسمیہ

سورہ فاتحہ بطور تفصیل تسمیہ

جو تعلق قرآن مجید کا سورہ فاتحہ سے بیان ہوا ہے۔ وہی تعلق فاتحہ کا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے ہے۔ یعنی سورہ فاتحہ خود جن حقائق کی تفصیل ہے۔ بسم اللہ ان کا اجمال ہے۔ "بسم اللہ" کے معنی و مفہوم پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ اب اس کو دہرانا تحصیل حاصل ہو گا۔ اس کے لیے "تسمیہ القرآن" کا حصہ ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ "تسمیہ" جن تین اسماء الٰہی (اللہ، رحمان اور رحیم) کے ذکر پر مشتمل ہے۔ سورہ فاتحہ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل مہیا کرتی ہے۔

سورہ فاتحہ کا آغاز بھی انہی مبارک اسماء سے ہوا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ — سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے۔

جس طرح بسم اللہ کے کلمات تلاوت قرآن اور ہر نیک کام کے لیے افتتاح کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح کلمات فاتحہ سے کتاب الٰہی کا افتتاح ہوتا ہے۔ تسمیہ ہر کام کے آغاز سے انجام تک باری تعالیٰ پر توکل کا درس دیتی ہے۔ فاتحہ بھی ہر معاملے میں اول سے آخر تک خدا شناسی و خدا پرستی کا درس دیتی ہے۔ تسمیہ خدا پرستی کا عنوان ہے۔ لیکن سورہ فاتحہ اس کا مکمل مضمون ہے۔ تسمیہ میں صرف اسم ذات "اللہ" سے آغاز کیا گیا ہے۔ لیکن فاتحہ میں "اللہ" کی شان الوہیت کا تفصیلی بیان بھی موجود ہے۔ جس کا آغاز اس طرح کیا گیا "کہ ہر کام اس اللہ کے نام سے شروع کیا جائے جو ہر کمال کا مالک اور ہر قسم کی تعریف کا حقیقی مستحق ہے"۔

پھر الوہیت کا تعارف شان ربوبیت کے حوالے سے کرایا گیا کہ وہ ذات الوہیت ہر قسم کی تعریف کی اس لیے مستحق ہے کہ ہر وجود کائنات کا کمال اسکا تربیت کا مرہون منت ہے۔ لہٰذا سورہ فاتحہ میں سب سے پہلے تسمیہ کے بقیہ کلمات "الرحمٰن

الرحیم" کو بیان کیا گیا۔ پھر اس کی تفصیل "جزا کا مالک" ہونے کے حوالے سے بیان کی گئی۔ تاکہ ہر ایک کو معلوم ہو جائے کہ وہ رحمان (نہایت مہربان) اس لیے ہے کہ اسے جزا و عطا پر قدرت کاملہ اور مالکیت تامہ حاصل ہے۔ وہ جس کو چاہے اپنی عنایات سے نواز سکتا ہے۔ اس پر کوئی قدغن یا پابندی نہیں' کیونکہ وہ خود ہی ہر عطا کا مالک ہے۔ چونکہ رحمانیت کے چشمے سے جو فیض رحمت میسر آتا ہے وہ عام ہے اس میں نیک و بد کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس لیے اسکی مالکیت و قدرت بھی تام ہے۔ اس میں کوئی نقص یا کمی نہیں کہ کسی کو عطا کر سکے اور کسی کو نہیں۔ مگر رحیمیت کے چشمے سے بالخصوص اہل ایمان ہی فیضیاب ہوں گے۔ اس میں نیک و بد کا امتیاز ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس لیے "یوم الدین" کا مالک ہونا اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ نیک اس کی بارگاہ سے جزا پائیں گے اور بدکار سزا پائیں گے۔ اس کی وضاحت سورہ فاتحہ کے آخر میں باری تعالیٰ کے انعام اور غضب' دونوں کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔ مزید برآں اگر تسمیہ اور سورہ فاتحہ کے تعلق کو از سر نو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ "بسم اللّٰہ" میں لفظ اللہ اور اس کی الوہیت جس حق کی سزاوار تھی۔ اسکی ادائیگی بندوں کی طرف سے عبادت ہی کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا سورہ فاتحہ نے "ایاک نعبد" کے اعلان کے ذریعے اس کی ادائیگی کا سامان فراہم کر دیا۔

اس کے بعد تسمیہ کے دوسرے لفظ الرحمٰن اور اس کی رحمیت جس حق کی سزاوار تھی اسکی ادائیگی بندوں کی طرف سے استعانت ہی کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا سورہ فاتحہ نے "ایاک نستعین" کے اعلان کے ذریعے اس کی ادائیگی کا سامان فراہم کر دیا۔

اسی طرح تسمیہ کے تیسرے لفظ الرحیم اور اس کی رحیمیت جس حق کی سزاوار تھی اس کی ادائیگی بندوں کی طرف سے طلب ہدایت و نعمت ہی کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا سورہ فاتحہ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا کے ذریعے اس کی ادائیگی کا سامان فراہم کر دیا۔ چنانچہ سورہ فاتحہ اس بنا پر بھی

تسمیہ کے عنوانات کی تفصیل قرار پا گئی۔

علیٰ ھذا القیاس تسمیہ نے انسانی زندگی کی ابتداء سے انتہا تک پورے ضابطہ و نظام کی بنیاد فراہم کی تھی کہ اللہ' انسانی زندگی میں سیاسی قوت کا سرچشمہ ہے' **الرحمن** انسان زندگی میں معاشی بقاء کا سرچشمہ ہے اور **الرحیم** انسانی زندگی میں مذہبی استحکام کا سرچشمہ ہے۔

سورہ فاتحہ نے سیاست' معیشت اور مذہب پر مشتمل پورے نظام زندگی کی تفصیل مہیا کر دی۔ جس کی وضاحت انشاء اللہ آگے آئے گی۔ بہر حال ہم بڑے وثوق سے اس امر کا اظہار کر سکتے ہیں کہ تسمیہ اجمال ہے اور فاتحہ اس کی تفصیل یا تسمیہ عنوان ہے اور فاتحہ اس کا مضمون ہے۔

باب-۱۴

سورہ فاتحہ سے
اجزائے ایمان پر استدلال

سورہ فاتحہ سے اجزائے ایمان پر استدلال

سورہ فاتحہ کو اس لحاظ سے کلید ایمان قرار دیا جاسکتا ہے کہ یہ ایمان کے تمام بنیادی اجزاء کو بیان کرتی ہے۔ ان کی تفصیل مختلف عنوانات کے تحت پہلے گزر چکی ہے۔ لیکن یہاں انہیں ضابطے کے مطابق دوبارہ درج کیا جاتا ہے۔ اجزائے ایمان سے مراد اعتقاد کے وہ بنیادی لوازمات ہیں جن سے کسی ایک کا بھی انکار اسلام سے خارج ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ اجزاء حسب ذیل ہیں:۔

ایمان باللہ ' ایمان بالرسالت ' ایمان بالآخرت ' ایمان بالملائکہ ' ایمان بالقدر۔

قرآن حکیم نے مذکورہ بالا اجزائے ایمان کو مختلف مقامات پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن بعض آیات میں ان میں سے اکثر عنوانات کو یکجا بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً نیکی کی تعریف کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ

(البقرۃ، ۲: ۱۷۷)

بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

(النساء، ۴: ۱۳۶)

اور جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اسکی کتابوں کا اور اسکے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا انکار کرے تو بے شک وہ دور دراز کی گمراہی میں بھٹک گیا۔

سورہ فاتحہ میں بھی ان اجزاء کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے:۔

ایمان باللہ

خدا کے ہونے بلکہ اس کے صرف ایک ہونے پر ایمان لانا اور اسے ہر قسم کے شریک سے منزہ تصور کرتے ہوئے ساری کائنات کا خالق و مالک اور پروردگار سمجھنا ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم ہے۔ اسلامی اعتقاد کا یہ پہلا جزو جس سے اسلام کا خمیر اٹھتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت میں مندرج ہے۔ جس میں باری تعالیٰ کو ہی تمام تعریفوں کا مستحق حقیقی اور ساری کائنات کا پروردگار بیان کیا گیا ہے۔

ایمان بالرسالت

اس سے مراد یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم انس و جن کی ہدایت کے لیے انبیاء و رسل کو اس دنیا میں مبعوث کیا ہے اور انہی کے ذریعے ہم سب کو ہدایت ربانی کی نعمت میسر آئی ہے۔ یہ تصور سورہ فاتحہ کی دوسری آیت میں کنایتاً اور پانچویں و چھٹی آیت میں صراحتاً بیان کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت پہلے واضح کی جاچکی ہے کہ عالم انس و جن پر باری تعالیٰ کی رحمت کاملہ نظام رسالت ہے۔ مستزاد یہ کہ بارگہ ایزدی سے ہدایت کا طلب کیا جانا اور انسانوں کو انعام یافتہ بندوں کے واسطے سے ہدایت ربانی کا ملنا ہی ایمان بالرسالت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ سورہ فاتحہ ہدایت کے لیے جن انعام یافتہ بندوں کی طرف رغبت کی تعلیم دے رہی ہے۔ قرآن کے مطابق ان میں سے اولین گروہ انبیاء و رسل کا ہے۔ جیساکہ ارشاد فرمایا گیا:۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ

یہی وہ لوگ (روز قیامت) ان (ہستیوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (خاص) انعام فرمایا ہے جو کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔

(النساء، ۴:۶۹)

لہٰذا ایمان کا دوسرا بنیادی رکن بھی سورہ فاتحہ کا مضمون قرار پاگیا۔

ایمان بالآخرت

اس سے مراد اس دنیا کے اختتام پر ایک ایسے دن کے انعقاد پر ایمان لانا ہے جس میں زندگی کے جملہ اعمال کا حساب و کتاب ہو گا۔ ہر شخص کو اپنے کیے پر جزا یا سزا ملے گی اور اس یوم قیامت کے بعد نئی اخروی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔ ایمان کا یہ تیسرا جزو سورہ فاتحہ کی تیسری آیت مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں بیان ہوا ہے۔ اگر آخرت کی منزل تسلیم نہ کی جائے تو زندگی کا سفر نا تمام رہ جاتا ہے اور اس کا کوئی مقصد واضح طور پر باقی نہیں رہتا۔

ایمان بالکتب

اس سے مراد یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے جو آسمانی کتابیں اور صحیفے انبیاء کرام پر بنی نوع انسان کی تعلیم کے لئے نازل کئے ہیں ان پر ایمان لے آنا۔ یہ وحی ربانی پر مشتمل آسمانی کتب و صحائف دراصل انسانوں کو توحید و رسالت کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاقی و روحانی زندگی بسر کرنے کا ضابطہ مہیا کرتے ہیں۔ اس جزو ایمان کا ذکر سورہ فاتحہ کی چوتھی آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں موجود ہے۔ جس میں انسان باری تعالیٰ کی عبادت اور اس سے استعانت پر مبنی زندگی بسر کرنے کا عزم کرتا ہے۔ یہی درحقیقت وہ ضابطہ حیات ہے جس کی تفصیلات آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے انسانوں کو عطا کی جاتی ہیں۔ اگر وحی ربانی پر مبنی آسمانی کتابیں انبیاء کرام کے ذریعے انسانوں کو عطا نہ کی جائیں تو انھیں کس طرح پتہ چلے کہ عبادت الٰہی کا مفہوم اور اس کی شرائط و ضوابط کیا ہیں؟ مزید یہ کہ خدا سے مدد طلب کرنا کیوں ضروری ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ سب کچھ پیغمبرانہ تعلیم کا ماحصل ہے جو وحی کی صورت میں ان پر نازل کی جاتی ہے۔ لہٰذا خدا کی عبادت و استعانت ہی وہ تعلیم ہے۔ جو ہمیں آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے نصیب ہوتی ہے۔ اسی پر یقین فی الحقیقت ایمان بالکتب کی روح ہے۔

ایمان بالملائکہ

فرشتوں پر یقین رکھنا ایمان کا پانچواں جزو ہے۔ سورہ فاتحہ رسالت اور وحی آسمانی پر ایمان لانے کا تقاضا کرتی ہے تو اس سے فرشتوں کا وجود از خود ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام پر وحی ہمیشہ بواسطہ ملائکہ نازل ہوتی رہی ہے اور شروع سے جبرائیل امین اسی امر پر ہی متعین ہیں۔ کئی دیگر ملائکہ بھی انبیاء و رسل اور ان کے مشن سے وابستہ رہے ہیں۔ گویا ملائکہ کا وجود نظام رسالت کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس لیے ان پر ایمان لانا عین تقاضائے عقیدہ رسالت ہے۔ بعض نام نہاد مفکرین اور محققین نے مغربی فکر سے لاشعوری مرعوبیت اور غیر مسلموں کے اعتراضات کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اپنانے کی وجہ سے فرشتوں کے صحیح اسلامی تصور کا ہی انکار کر دیا ہے۔ ان کے بارے میں جو عقیدہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس کی ایسی فاسد توجیہ کی ہے کہ انھیں بجائے مستقل آسمانی مخلوق کے اسی طبیعی کائنات (PHYSICAL WORLD) کی مادی قوتوں یا توانائیوں سے تعبیر کر دیا ہے۔ یہ الحادی فتنہ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ بعض ذہن سائنسی تحقیقات کے غلبہ و نفوذ سے متاثر ہو کر اسلامی اعتقاد کے جملہ پہلوؤں کو بھی اسی پیمانے پر پرکھتے ہوئے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے صرف نظر کر بیٹھتے ہیں کہ سائنسی تحقیق کا دائرہ کار صرف طبیعی کائنات اور اس کے حقائق تک محدود ہے۔ اس کا مابعد الطبیعی حقائق اور ماورائے محسوسات سے کوئی تعلق نہیں۔ ملائکہ ہوں یا عالم آخرت، وجود رسالت ہو یا ہستی باری تعالیٰ، یہ سب چیزیں ماورائی حقیقتیں ہیں۔ ان کے بارے میں سائنس اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ حقائق سرے سے سائنس کا موضوع تحقیق ہی نہیں۔ ان اعتقادی حقیقتوں کی ماہیت کو سائنسی اور فلسفیانہ پیمانوں پر متعین کرنا ایسے ہی ہے جیسے ایک مادر زاد نابینا رنگوں میں امتیاز کی ماہیت کو سمجھنا چاہے یا ذائقہ کی حس سے پیدائشی محروم شخص کڑوے اور میٹھے کا فرق معلوم کرنا چاہے۔ جو

قیقت مخصوص حواس یا دیگر ذرائع ادراک میں سرے سے آ ہی نہ سکے اسے ان رائع کے متعین کردہ پیمانوں سے سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کرنا یقیناً عقیدے کا ہرہ مسخ کرنے کے مترادف ہو گا۔ پھر ایسے استدلال کو عقلی استدلال کہنا سب سے بڑی بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے؟ جب طبعی علوم کے اندر فلسفہ' ریاضی' نفسیات' طبیعات' یمیا' حیاتیات وغیرہ کے بنیادی اصول' مسلمات اور ضوابط تحقیق جدا جدا ہیں۔ ان میں ے کسی ایک فن کے اصول پر کسی دوسرے فن کے مسئلے کو حل نہیں کیا سکتا اور نہ ہی یک فن کا استاد دوسرے فن اور اس کے علمی و تحقیقی تقاضوں کو پورا کیے بغیر اس کے کسی موضوع پر رائے زنی کرتا ہے۔ اسی کو آداب علم و تحقیق کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص سائنس اور فلسفہ کے ضابطوں کی بناء پر مذہب کے ماورائی حقائق کی نسبت حتمی فتویٰ صادر فرمانے کی ہمت کرتا ہے۔ ہر شخص اپنے فہم کے مطابق جو چاہتا ہے اسلام کے مابعد الطبیعی مسائل کی توجیہ کرتا ہے اور اس کا نام تحقیق جدید یا روشن خیالی رکھ دیتا ہے۔ خواہ اس تصور کو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے کوئی مناسبت ہو یا نہ ہو۔ ہر شخص کو اس حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیے کہ مذہب کے باب میں صحیح اور حتمی فیصلہ صاحب نبوت کا قول ہے۔ خواہ وہ قرآن سے ثابت ہو یا حدیث سے۔ اس کے سوا کسی کی تحقیق حتمی سند نہیں ہو سکتی۔ جب سے اسلام کی جملہ تعلیمات اور حقائق کو آسان اور عوامی بنانے کی مہم شروع ہوئی ہے۔ اس وقت سے "محققین" نے احادیث کے ذخیرہ علم سے استفادہ نہ کر سکنے کی کمزوری کو چھپا کر اسے غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اپنا مرکز تحقیق صرف قرآن کو بنا لیا ہے تاکہ قرآن میں رائے زنی کے ذریعے ہر قسم کی فاسد تاویل کا دروازہ کھولا جا سکے۔ یہ فتنہ اس دور کی پیداوار ہے جس نے اسلامی عقائد کے اصل تصور کو رجعت پسندی اور قدامت پرستی کا نام دے کر رد کر دیا ہے۔

لہٰذا حیات بعد الموت' روز قیامت' عالم آخرت' وجود ملائکہ اور اس قسم کے دیگر مابعد الطبیعی تصورات' آزاد خیالی کا شکار ہو گئے ہیں اور عام ذہنوں سے یہ خیال محو

ہو نا جارہا ہے کہ ان عقائد کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ اسی طرح عام مذہبی ذہن بھی اس مغالطے کا شکار ہو گیا ہے کہ شاید سائنس ان تمام اعتقادات کا انکار کرتی ہے یہ وہم بھی سائنسی تحقیق کا دائرہ کار نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہوا ہے۔ سائنس کا ان حقائق کے اثبات یا انکار سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر کوئی سائنسدان ایسے اعتقادات کا انکار کرتا ہو تو یہ اس کا ذاتی عمل ہو گا۔ اس میں سائنس کا کوئی قصور نہیں۔ سائنس تو صرف کائنات کی طبعی حقیقتیں منکشف کرنے کا عمل ہے اور وہ بھی تقریباً اسی (۸۰) فیصد ظنی ہے۔ اس کا بہت کم حصہ یقینی ہے۔ یہ طبیعی حدود کے اندر اسلام کے دعاوی کو سمجھنے اور ان کی حقانیت کو پانے میں تو ممد ہو سکتی ہے۔ لیکن مابعد الطبیعی حقائق کی توجیہ کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

ایمان بالقدر

اس سے مراد یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ خیر و شر کی قدرت انسانوں کو باری تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ قادر مطلق صرف اللہ ہے انسان نہیں۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ یہ قدرت انسانوں کے عزم و ارادے میں دخل انداز نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اس کا اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نہ اپنے کیے کا ذمہ دار رہتا ہے اور نہ بارگاہ ایزدی میں جوابدہ۔ لہٰذا انسان اپنے عمل کا کاسب ضرور ہے خالق نہیں۔ جزاو سزا سب کچھ اس کے کسب کا نتیجہ ہے۔ جس میں وہ کلیتاً مختار اور صاحب ارادہ ہے۔

سورہ فاتحہ نے باری تعالیٰ کے انعام اور غضب' دونوں کا ذکر کیا ہے۔ انعام' جزا ہے اور غضب سزا' اگر ذات حق سیدھی راہ پر چلنے والوں پر اپنا انعام اور غلط راہ پر چلنے والوں پر اپنا غضب فرماتی ہے تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انسان کا سیدھی یا الٹی راہ پر چلنا اس کے ارادہ و اختیار سے ہے۔ اگر راہ ہدایت کو سمجھنا اور اپنانا یا راہ ضلالت کو سمجھنا اور اپنانا انسان کی اپنی ذمہ داری نہ ہوتی تو وہ ان میں سے کسی کے کسب کی بنا پر بھی نہ جزا کا مستحق ہو سکتا ہے نہ سزا کا۔ اس کا مستحق جزا (انعمت علیھم) اور مستحق سزا (مغضوب علیھم) ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سورہ فاتحہ کے مضمون کے مطابق

انسان ہر دو راستوں کو اپنانے اور ان کا صلہ و انجام پانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ ذمہ داری، بغیر ارادہ و اختیار کے ممکن نہیں۔ اگر انسان کو یہ حاصل نہ ہو تو وہ ذمہ دار نہ رہا۔ اگر ذمہ دار نہ ہو تو باری تعالیٰ کے سامنے جوابدہ نہ رہا۔ اگر جوابدہ نہ ہو تو جزا و سزا کا کوئی سوال نہ رہا۔ اگر جزا و سزا نہ ہو تو حشر و نشر کا کوئی وجود نہ رہا۔ اگر حشر و نشر نہ ہو تو حیات بعد الموت کا کوئی تصور نہ رہا۔ اگر حیات بعد الموت نہ ہو تو قیامت کا وجود نہ رہا۔ اگر قیامت کا وجود نہ ہو تو عالم آخرت باقی نہ رہا۔ اگر عالم آخرت نہ ہو تو اس دنیوی زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا۔ اگر اس دنیوی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو تو نظام رسالت کی کوئی ضرورت نہ رہی اور اگر نظام رسالت نہ ہو تو وجود خدا کی کوئی معرفت باقی نہ رہی۔ الغرض انسان کا صاحب ارادہ و اختیار ہونا اور اس کی بنا پر انعام و غضب کا مستحق ٹھہرنا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر مذہب کا سارا تصور کھیل تماشا بن جاتا ہے۔ اس لیے سورہ فاتحہ نے اپنی تعلیم کا نقطۂ آخریں انسان کے حق میں کسب خیر و شر کی قدرت و توفیق کو قرار دیا ہے۔ اس وضاحت سے جبریت (DETERMINISM) کے تمام تصورات کا غیر اسلامی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

باب-۱۵

سورہ فاتحہ سے
ارکان اسلام پر استدلال

سورہ فاتحہ سے ارکان اسلام پر استدلال

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر رکھی گئی ہے:-

"شہادت توحید و رسالت، اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ، صوم رمضان اور حج کعبہ"

انہی پانچ ستونوں کو ارکان اسلام کہا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ ایک اعتبار سے ان ارکان اسلام کی روح کی تعلیم بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اگر آپ سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیات پر غور کریں تو ان میں باری تعالیٰ کے پانچ اسماء بیان ہوئے ہیں:-

"اللہ، رب، رحمان، رحیم اور مالک"

حقیقت یہ ہے کہ ہر اسم باری ایک رکن اسلام کی روح کی تبلیغ کر رہا ہے۔ بلکہ اہل نظر کو ہر اسم باری کی تجلی سے ایک رکن اسلام کی حقیقی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

اسم "اللہ" کے انوار کی تجلی انسان کے اندر ایمان کی حالت کو جنم دیتی ہے۔ ایمان فی الحقیقت توحید و رسالت کے اقرار و تصدیق ہی کا نام ہے اور یہی اسلام کا پہلا رکن ہے۔ چونکہ اللہ خالق ہے، لہٰذا اس اسم مبارک کے انوار سے ایمان کو وجود نصیب ہوتا ہے اور انسان حالت کفر سے ہجرت کر کے حالت ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔

اسم "رب" تربیت اور پرورش کے ذریعے دوسروں کو ترقی اور کمال سے ہمکنار کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ اہل علم و عمل جانتے ہیں کہ ایمان کی پرورش و تربیت اور اس کی ترقی و کمال کا اعلیٰ منہاج "نماز" ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:-

الصلوٰۃ معراج المومنین نماز مومنوں کی معراج ہے۔

لہٰذا اسم "رب" کی تجلی سے بندہ نماز کی حقیقت کو پاتا ہے۔ جس کے باعث اس کے ایمان کی پرورش ہوتی ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:-

لیس بین العبد وبین الکفر الا ترک الصلوٰۃ (سنن نسائی، ۱: ۸۱)

مسلمان اور کافر کے درمیان فرق صرف نماز کا ہے۔

نماز ارکان اسلام میں سے دوسرا رکن ہے۔ جس کی معرفت سورہ فاتحہ کے دوسرے اسم باری کی تجلی سے حاصل ہوتی ہے۔

اسم "رحمان" کا معنی نہایت مہربان ہے۔ اس میں رحمت کا مبالغہ پایا جاتا ہے اور ارکان اسلام میں سے تیسرا رکن بھی "زکوٰۃ" ہے۔ جو غرباء و مساکین کے حق میں صدور رحمت ہی کی ایک موثر صورت ہے۔ لہٰذا رحمانیت کے انوار کی تجلی انسان کو زکوٰۃ کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے اور وہ بھی ذات رحمان کی طرح پیکر رحمت بن جاتا ہے۔

اسم "رحیم" میں مانگنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور ان سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آنا شامل ہے۔ کیونکہ ذات رحیم حاجتمندوں کی حالت سے صرف نظر نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ارکان اسلام میں سے چوتھا رکن "روزہ" ہے۔ روزہ الزام نیت کے ساتھ صبح سے شام تک کھانے پینے اور بعض دیگر حوائج انسانی سے پرہیز کرنے کا نام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ انسانوں کو پورا دن کھانے پینے سے محروم کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ مزید یہ کہ بھوکا پیاسا رہنا آخر کونسی عبادت ہے؟ جس کی تحصیل روزے پر منحصر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بھوک اور پیاس ہرگز ذاتی طور پر مقصود نہیں ہے۔ انسان کو اس مشقت میں سے اس لیے گزارا جاتا ہے کہ اس سے پتہ چلے کہ بھوکے پیاسے رہنے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے؟ جن کو ضروریات زندگی کماحقہ میسر نہیں ہوتیں۔ ان کے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہیں؟ جب تک ایک کیفیت انسان کے اوپر خود نہ گزرے وہ اس کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ روزہ رکھنے سے انسانوں کو بھوک اور پیاس کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ اس کیفیت کو محسوس کر کے ضرورت مندوں کی کفالت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ روزہ اس کی

شخصیت کو رحیمیت کے نور سے منور کرتا ہے۔ اس لیے اسم "رحیم" کی تجلی مسلمانوں کو اسلام کے چوتھے رکن "صوم رمضان" کی حقیقت عطا کرتی ہے۔

آخر میں "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن" کا اسم مبارک بیان کر کے یوم قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قیامت کا دن فی الواقع تمام انسانوں کی حقیقی ہجرت کا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب تمام لوگ اپنے وطن، گھربار، اعزاء و اقارب اور دنیوی تعلقات کو چھوڑ کر الگ تھلگ اور خالی ہاتھ محض مسافروں کی طرح بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوں گے۔ اس آیت کی تجلی "سفر حج" کی حقیقت عطا کرتی ہے جو ارکان اسلام میں پانچواں رکن ہے۔ حج کا سفر بھی ہجرت وطن کا سماں پیدا کرتا ہے۔ جس میں انسان خالی ہاتھ، سر اور پاؤں سے ننگا، صرف دو چادریں زیب تن کیے ہوئے گھربار اور بیوی بچوں سے دور، دنیوی تعلقات سے الگ تھلگ بارگاہ ایزدی میں حاضر "لبیک لبیک" پکار رہا ہے۔ ایک ہی حالت میں لاکھوں مسافر مسلمانوں کا یہ جم غفیر روز محشر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن" کے الفاظ ہمیں سفر قیامت اور سفر حج کی مشابہت کی بناء پر فریضہ حج کی حقیقی معرفت سے نوازتے ہیں اور انسانوں کو ہمہ وقت ہجرت پر تیار رہنے کا درس بھی دیتے ہیں۔ بایں وجہ یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سورہ فاتحہ ارکان اسلام کی حقیقت بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اجزائے ایمان اور ارکان اسلام کی حقیقت کا جامع ہونا سورہ فاتحہ کا اپنا امتیاز اور انفرادی شرف ہے۔ جس کی وجہ سے اسے سور قرآنی میں اور اس کے مضمون کو تعلیمات اسلامی میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ یہی ارکان اسلام کی تعلیمی روح ہے کہ بندہ حضرت الوہیت کے فیضان سے اپنے اندر ایمان کی دولت پیدا کرے اور وہ ایمان، توحید و رسالت کے اقرار و تصدیق سے عبارت ہو۔ حضرت ربوبیت کے فیضان سے وہ اپنے ایمان کو نماز کے ذریعے ترقی دے اور ہمہ وقت یاد حق میں مصروف رہے۔ یعنی اس کی نماز فی الواقع اس کے ایمان کی مربی اور پرورش کرنے والی ثابت ہو۔ حضرت رحمانیت کے فیضان سے وہ اپنے اندر حقیقت زکوٰۃ کو جاگزیں کرے اور کمزور و ناتواں

انسانیت پر ہمہ وقت رحم و کرم کے ساتھ متوجہ رہے۔

حضرت رحیمیت کے فیضان سے وہ ضرورت مندوں کی مناجات و ضروریات کی کفالت کا ذمہ اٹھائے۔ اس کا روزہ' اس کے اندر دکھی انسانیت کا یہی احساس پیدا کرے۔ اور حضرت مالکیت کے فیضان سے وہ حقیقت حج کو اس طرح پائے کہ ہر وقت خدا کی راہ میں ہجرت کی خاطر اپنا گھربار' مال و دولت اور رشتہ و تعلق' سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہے۔ اگر انسان ان پانچ خصوصیات کو اپنے اندر پیدا کر کے راسخ کرے تو وہ یہ سمجھے کہ اس نے ارکان اسلام کی روح اور سورہ فاتحہ کی حقیقت کو پالیا ہے اور بے شک یہی انسانیت کا کمال ہے۔

باب-۱۶

سورہ فاتحہ
اور
شخصیتی تکمیل کے سات مراحل

سورہ فاتحہ اور تشکیل شخصیت

اب ہم انسانی شخصیت کی تشکیل کے ضمن میں سورہ فاتحہ کی تعلیمات اور تاثیرات پر غور کرتے ہیں۔ سورہ فاتحہ دعا ہونے کے اعتبار سے تمام سور قرآنی اور مسنون دعاؤں میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر کوئی دعا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلے اور وہ انتہائی کثرت کے ساتھ وردِ زباں بھی ہو تو اس کے اثرات کا شخصیت کے ظاہر و باطن پر مترتب ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ غور فرمائیے کہ سورہ فاتحہ سے بڑھ کر ہر وقت وردِ زبان بننے والی اور کونسی دعا ہو گی جو انسان حالت نماز میں ہر رکعت کے اندر مانگتا ہے۔ اگر اس کی تاثیر بھی اپنی جگہ مسلم ہو اور مانگنے والا بھی خلوص دل سے مانگ رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے اثرات و برکات سے اس کی شخصیت فیض یاب نہ ہو سکے۔ لہٰذا جب سورہ فاتحہ کی سات آیات بار بار انسان کی زبان سے ادا ہوتی ہیں اور اس کا دل بھی زبان کے ساتھ اس دعا میں شریک ہوتا ہے ہو تو اس کے نتیجے میں اس کی شخصیت رفتہ رفتہ ایک خاص ڈگر پر ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ جب تعلیمات فاتحہ کا رنگ انسان کے ظاہر و باطن پر چڑھتا ہے تو انسانی شخصیت اپنے نقطۂ کمال کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے اور انسان صفات الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے۔

آیئے اب اس امر کا جائزہ لیں کہ سورہ فاتحہ کے فیضان سے تشکیل شخصیت کا کام کس طرح انجام پذیر ہوتا ہے۔ وہ سات خصوصیات جن سے انسان سورہ فاتحہ کی تعلیمات کے باعث متصف ہو کر عظمت کی تصویر بنتا ہے درج ذیل ہیں:-

۱:- انسان ----- عالمگیر انسانی اخوت کا پیکر

۲:- انسان ----- رحمت اور شفقت کا پیکر

۳:- انسان ----- عدالت اور امانت کا پیکر

۴:- انسان ----- استغناء اور عزت نفس کا پیکر

۵:- انسان-----تواضع اور نیازمندی کا پیکر

۶:- انسان-----اعتدال اور توازن کا پیکر

۷:- انسان-----حق و باطل میں واضح امتیاز کا پیکر

سورہ فاتحہ کی مذکورہ بالا تعلیمات کے سانچے میں انسانی شخصیت کس طرح ڈھل کر نکلتی ہے۔ اب ہم اس امر کا جائزہ لیتے ہیں:-

انسان-----عالمگیر انسانی اخوت کا پیکر

جب انسان اپنی زبان سے **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** پکارتا ہے۔ تو وہ خدا کی آفاقی، کائناتی اور عالمگیر ربوبیت کا اقرار کر رہا ہوتا ہے۔ "**رب العالمین**" کے الفاظ اس تصور کی نفی کر دیتے ہیں کہ وہ کسی خاص نسل، قبیلے، علاقے یا گروہ کا رب ہے۔ اس کی ربوبیت تمام امتیازات سے ماوراء ہے۔ اس کی ربوبیت کے لیے تمام نسلیں، تمام قبیلے، تمام علاقے اور تمام گروہ یکساں ہیں۔ اس کی ربوبیت کے سامنے تمام علاقائی، نسلی لسانی اور گروہی امتیازات کے بت پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ کوئی مندر جاتا ہے یا مسجد میں کلیسا جاتا ہے یا گرجے میں، کوئی جنگلوں میں عبادت کرتا ہے یا غاروں میں، کوئی سرے سے اسے جانتا بھی ہے یا نہیں یا کوئی جانتا ہے تو مانتا نہیں، کوئی ہوائے نفس کو اپنا خدا سمجھتا ہے یا دیگر دنیوی مفادات کو، الغرض جو کوئی جس حال میں بھی بس رہا ہے۔ اس کی ربوبیت کے فیضان سے محروم نہیں رہ سکتا۔ یہاں تک کہ غیر ذی شعور مخلوق، حیوانات ہوں یا جمادات و نباتات، جن کو مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ ہر کسی کو اس کی عالمگیر ربوبیت کا فیض میسر آ رہا ہے۔ اس کی بارگاہ میں پہنچ کر سب عصبیتیں اور محدود گروہی وفاداریاں، سب رنگ و نسل کے امتیازات اور طبقاتی تفاوت مٹ کر ایک وحدت میں گم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی ربوبیت سب کے لیے یکساں ہے۔

جب انسان ایسے رب پر ایمان لاتا ہے اور اسے اپنا خالق و پروردگار سمجھتا ہے تو سورہ فاتحہ کی یہی پہلی آیت اسے جھنجھوڑ کر کہتی ہے کہ اے رب کائنات کی عالمگیر

ربوبیت کا دم بھرنے والے! کیا تو نے بھی اس کا بندہ ہونے کے لحاظ سے اپنی وفاداریوں کو عالمگیر انسانی اخوت میں بدل لیا ہے یا نہیں؟ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت انسان کا دامن پکڑ کر تنبیہہ کرتی ہے کہ تو بھی اپنے رب کریم کی آفاقی ربوبیت کا مظہر بنتے ہوئے پوری انسانیت کے لیے پیکر اخوت بن جا' نفرتوں اور عصبیتوں کے وہ تمام بت جو محدود ذاتی مفادات کی خاطر تراشے گئے ہیں توڑ دے۔ بحیثیت انسان نسلی' علاقائی اور دیگر گروہی امتیازات سے ماوراء ہو جا۔ طبقاتی اور فرقہ وارانہ وفاداریوں میں ملوث رہنا تجھے زیب نہیں دیتا۔ اگر تو پوری انسانیت کے لیے اخوت و محبت کا پیغامبر نہیں بنتا تو پھر اس حقیقت کا اعتراف کرلے کہ یا تو نے باری تعالیٰ کی ربوبیت کو عالمگیر اور آفاقی نہیں مانا' یا تو نے خود کو اس کا بندہ و مطیع نہیں سمجھا اگر تو اسے رب کائنات بھی مانتا ہے اور خود کو اس کا بندہ بھی' تو کیا وجہ ہے کہ تو محدود وفاداریوں کے تنگ حصار سے باہر نہیں نکلتا۔ تیری سوچ کی پرواز کائناتی افق تک کیوں نہیں پہنچتی' تو دنیا کے ہر انسان کو اپنے رب کریم کا بندہ سمجھتے ہوئے اس کی بہتری اور فلاح کا جذبہ اپنے اندر کیوں پیدا نہیں کرتا۔ تو ہر ایک کے لیے پیکر اخوت و محبت کیوں نہیں بنتا؟ جس طرح ربوبیت الٰہی کے لیے یہ سزاوار نہ تھا کہ وہ اپنی عنایات کسی مخصوص گروہ یا علاقے کے لیے مختص کر دیتی۔ اسی طرح انسانی عظمت کا بھی یہ تقاضا نہیں ہے کہ انسان تنگ نظری' تعصب اور محدود سوچ کا حامل ہو جائے۔

لہٰذا سارے تعصبات کے بت اور محدود وفاداریوں کے حصار توڑ کر بحیثیت نسان عالمگیر انسانی اخوت کے پیکر بن جاؤ۔ تاکہ تم یہ بات کہنے میں سچے بن سکو کہ ہم اس ب کائنات کے بندے ہیں جس کی ربوبیت عالمگیر اور غیر محدود ہے۔

انسانی اخوت کا یہ عالمگیر جذبہ محض زبانی اعتراف اور نعرہ بازی سے حقیقت یں بنتا۔ جب تک انسان اس پر دل سے ایمان لاکر اپنے عمل کے ذریعے اس کا ثبوت زاہم نہیں کرتا' اس کے دعوے سوائے منافقت' عیاری اور دجل و فریب کے کوئی نشت نہیں . کھتے۔ ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ کچھ لوگ تو ظاہراً بھی محدود گروہی

مفادات میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن بیشمار مصلحین، مبلغین اور رہبران قوم کی حالت یہ ہے کہ زبان سے اسلامی وحدت اور انسانی اخوت کا نام لیتے ہیں، اتحاد اور رواداری کے راگ الاپتے ہیں۔ تعصبات اور فرقہ واریت کی نفی اور تردید کرتے ہیں۔ لیکن خود اتنے بڑے متعصب فرقہ پرست واقع ہوتے ہیں کہ اپنے اور اپنے مخصوص حلقے کے سوا نہ کسی اور کو مسلمان سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو زندہ رہنے کا حق دینا چاہتے ہیں۔ دوسروں پر فرقہ پرستی کا الزام دے کر، لوگوں کو اس سے پرہیز کی تلقین کرکے جس قدر تنگ نظری اور محدود گروہی و جماعتی تعصب کا عملی اظہار کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اسلام اور ملت اسلامیہ کے ساتھ ظلم ممکن نہیں۔ درحقیقت بیشمار لوگوں نے خود کو "اسلام" اور اپنی مخصوص مفاد پرستانہ سوچ کو "اسلامی وحدت" کا نام دے کر اپنے سوا باقی تمام لوگوں اور اکائیوں کو "فرقہ" قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ان سے الگ ہیں فرقہ کہلاتے ہیں۔ جو ان سے اختلاف کرتا ہے فرقہ پرست تصور ہوتا ہے۔ جو ان کی مخصوص سوچ کا ہمنوا نہیں بنتا اس پر اسلام اور اسلامی وحدت کے دشمن ہونے کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح پورا عالم اسلام "فرقہ" بن جاتا ہے اور وہ مخصوص طبقہ "اسلامی وحدت"۔

ہمارے قول و عمل کا یہ تضاد، کھلی منافقت ہے۔ اس طرح ہم لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ خود اسلام کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں۔ اسلامی وحدت اور اسلامی اخوت کا اظہار دوسروں سے نفرت، تعصب اور ان سے حق زیست چھین لینے سے نہیں بلکہ ہر ایک کو سینے سے لگانے اور اس کی فلاح و بہبود کی خاطر خود کو قربان کر دینے سے ہوتا ہے۔ اگر عمل، اخوت و محبت کے بجائے وحشت و بربریت پر دلالت کرے اور زبان و قلم پر وحدت و اخوت کے نعرے ہوں تو اس کی حیثیت محض دجل و فریب کی سی ہے۔ جس سے ہر ایک کو دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔

سن لیجئے! صریح فرقہ پرستی ہو یا منافقانہ، سب انداز اسلامی وحدت کے شیرازے کو منتشر کرتے ہیں۔ اور یہ سب منفی عصبیتیں خدا کی عالمگیر ربوبیت کا انکار بھی

ہیں۔

آیئے! ہم قول اور فعل کے کھلے اور چھپے سب تضادات سے توبہ کریں۔ نفرتوں اور عصبیتوں کے بت توڑ کر عالمگیر انسانی اخوت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں تا کہ ہمارا تعلیمات اسلامی کا پرچار معاشرے میں صحیح نتائج پیدا کر سکے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل — دل ونگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

انسان------رحمت اور شفقت کا پیکر

جب انسان سورہ فاتحہ کی دوسری آیت **الرحمٰن الرحیم** کی تلاوت کرتا ہے تو اس کے ذریعے وہ باری تعالیٰ کی صفت رحمت کا تذکرہ کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات ہیں اور ہر صفت اس قدر عظمت کی حامل ہے کہ اس میں کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن باری تعالیٰ نے اپنی ربوبیت عامہ کے تعارف کے لیے سب سے پہلے جس صفت کا انتخاب کیا ہے وہ صفت رحمت ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ یوں تو اس ذات کی تمام صفات اور کمالات انتہائی بلند و بالا اور وسیع ہیں۔ مگر اس کی رحمت ایک ایسی صفت ہے جو ہر کمال پر محیط اور اس کے ہر فعل سے یکساں چھلکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی کسی اور صفت کو اتنی کثرت کے ساتھ بیان نہیں کیا اور نہ ہی کوئی اور موضوع اس قدر نمایاں انداز میں صفحات قرآن پر درج نظر آتا ہے۔ جتنا رحمت باری تعالیٰ کا بیان ہے۔ رحمت الٰہی کا ذکر قرآن مجید میں صریح الفاظ کے ساتھ تین سو(۳۰۰) سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ اگر ایسے تمام مقامات جمع کر لیے جائیں جہاں اگرچہ لفظ "رحمت" صراحت کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ لیکن بیان مضمون رحمت کا ہی ہوا ہے۔ مثلاً اس کی، ربوبیت، مغفرت، رافت، کرم، عفو، حلم اور دیگر انعامات ایزدی جو دنیا و آخرت میں بندگان خدا کے لیے مقرر کیے گئے ہیں تو ان کی تعداد شمار سے ماوراء ہو جاتی ہے اور بیان رحمت اتنا پھیل جاتا ہے کہ پورا قرآن ہی مضمون رحمت کا بیان دکھائی دیتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں ربوبیت الٰہی کا اولین تعارف ہی بیان رحمت سے کرایا جانا اس امر کی

شاہد بھی ہوتا ہے کہ اسلام نے انسان کے اندر خدا پرستی کی بنیاد جلال پر نہیں جمال پر رکھی ہے۔ قہر و غضب پر نہیں رحمت و رافت پر رکھی ہے۔ خوف سزا پر نہیں لطف عطا پر رکھی ہے۔ وحشت پر نہیں محبت پر رکھی ہے' یہاں تک کہ تصور جزا پر بھی نہیں' تصور رضا پر رکھی ہے۔

یہ آیت انسان کو ندا دیتی ہے کہ وہ بھی اپنے رب رحیم کی مظہریت میں صفت رحمت کا پرتو اپنی شخصیت میں پیدا کرلے۔ کیونکہ صفت رحمت سے تخلق ہی انسانیت کا کمال ہے۔ اس نے انسان کی تشکیل شخصیت کے لیے اپنی ربوبیت اور رحمت کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ انسانی اخلاق کا چراغ بھی صفات الہیہ سے ہی روشن ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ باری تعالیٰ نے جوہر انسانیت کی تخلیق کو اپنی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ	پھر اس کو ٹھیک بنایا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور تمہارے لئے کان آنکھ اور دل بنائے۔
(السجدہ' ۹:۳۲)	

پس اے بنی نوع انسان! اگر اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی ربوبیت کا ذکر کرتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ تم بھی اپنے چہرہ اخلاق میں ربوبیت کے خدوخال پیدا کرلو۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی خوبیوں کا حسین و جمیل اور لائق حمد و ستائش مرقع بار بار پیش کرتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے تم بھی اپنے آئینہ شخصیت میں اس کے حسن و جمال کا جلوہ پیدا کرلو۔۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی بے پایاں رحمت کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے تم بھی ساری مخلوق کے لیے سرتاپا رحمت و محبت بن جاؤ۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی رافت و شفقت اور جود و احسان کا نقشہ کھینچتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے' تم بھی بندوں کے لیے عفو و درگزر اور لطف و کرم کا پیکر اتم بن جاؤ' اگر ہم اس کے بندوں پر رحم و کرم نہیں کرسکتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں اور لغزشوں پر اس کے لطف و کرم کا انتظار کریں۔ اس لیے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۞ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۞
(آل عمران ۳: ۱۳۴)

اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگذر کرنے والے ہیں' اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:-

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۞
(الرعد '۱۳: ۲۲)

اور جو لوگ اپنے رب کی رضاجوئی کے لئے صبر کرتے ہیں اور نماز قائم رکھتے اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (دونوں طرح) خرچ کرتے ہیں اور نیکی کے ذریعہ برائی کو دور کرتے رہتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا (حسین) گھر ہے۔

ایک اور مقام پر اسی امر کی تلقین یوں کی گئی ہے:-

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۞
(الشوریٰ '۴۲: ۴۳)

اور جو کوئی برائی اور زیادتی پر صبر کرے' بلکہ معاف کر دے۔ تو یقیناً یہ بڑے بلند حوصلے کی بات ہے۔

لمحۂ فکریہ

قرآن حکیم تو انسانوں کو اپنے مخالفوں اور دشمنوں کی زیادتی پر بھی ان سے زیادتی کرنے کا درس نہیں دیتا بلکہ ہر حال میں رحمت کی تعلیم دیتا ہے۔ صبرو تحمل اور عفوو درگزر کی تلقین کرتا ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنوں ہی کے خون سے منہ رنگ رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص خونخوار بھیڑیا ہے۔ دوسروں کی عزت سے کھیلنا' کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا' دوسروں کو پریشان کرکے اپنے مفادات کا تحفظ

کرنا ہر ایک سے دھوکہ و فریب اور کمزوروں کے لیے قہر و غضب کا پیکر ثابت ہونا ہمارا شعار ملی بن چکا ہے۔ جب ہم خدائے بزرگ و برتر کو اپنا رب اور رحمان و رحیم کہتے ہوئے بھی خود دوسروں کے لیے باعث رحمت نہیں بنتے تو گویا ہمارا سارا کلام، جھوٹ اور عقیدہ منافقت قرار پاتا ہے۔ اسکے باوجود ہم اپنے رب سے کبھی کبھی شکوہ کناں بھی ہوتے ہیں۔

شنیدم که مردان راه خدا
دل دشمناں هم نه کردن تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام
که با دوستانت خلاف است و جنگ

سورہ فاتحہ کی یہ آیت انسان کو تشکیل شخصیت کے لیے دوسرا سبق یہ دیتی ہے کہ خلق خدا سے محبت کرو، نفرت نہ کرو۔ ہر ایک پر رحم کرو، ظلم نہ کرو، ہر کسی سے وفا کرو، جفا نہ کرو۔ گناہ سے نفرت کرو، گناہ گار سے نہیں۔ مرض سے نفرت کرو، مریض سے نہیں۔ غربت سے نفرت کرو غریب سے نہیں۔ کیونکہ گناہگار تمہارے التفات کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ مریض تمہارے رحم و کرم کا زیادہ حقدار ہوتا ہے اور اسی طرح غریب تمہاری شفقت و محبت کا زیادہ سزاوار ہوتا ہے۔ نیکوکار تو ہر ایک کو بھلے لگتے ہیں۔ لیکن گنہ گاروں کو سینے سے لگانے والا کوئی نہ رہے تو انہیں توبہ کی نصیحت کس طرح ہو گی۔ یوں تو گنہ گار مزید وحشت اور نفرت کا شکار ہو کر درندہ صفت ہو جائیں گے۔ صحت مندوں سے تو ہر کوئی محبت کرتا ہی ہے لیکن بیماروں سے پیار کرنے والا کوئی نہ رہے تو ان کی شفایابی کا سامان کس طرح فراہم ہو گا۔ یوں تو بیمار مزید تکلیف کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن جائیں گے۔ دولت مندوں سے تو ہر کوئی لگاؤ رکھتا ہی ہے۔ لیکن غریبوں سے الفت کرنے والا کوئی نہ رہے تو ان کے دکھ درد کا درماں کس طرح ہو گا۔ یوں تو مفلس و قلاش، مزید غربت کا شکار ہو کر یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے یا عزت و ضمیر سے۔

لہٰذا نیکوکاروں سے زیادہ گنہ گار، صحت مندوں سے زیادہ بیمار اور دولت

بندوں سے زیادہ غریب لوگ ہماری توجہ اور رحمت و محبت کے مستحق ہیں۔ طبیب کا کام مرض سے نجات دلانا ہے مریض سے نہیں، اسی طرح اگر کوئی گنہ گار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے قلب و باطن کی صحت بحال نہیں رہی، اس کی روح بیماری کا شکار ہو گئی ہے۔ چنانچہ اسے سوسائٹی کا کمین شخص گردان کر دھتکار دینا حکمت و مصلحت نہیں بلکہ اسے قریب لا کر اس کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔ اگر گناہگاروں اور معصیت کیشوں سے نفرت ہی مقصود مذہب ہوتی تو باری تعالیٰ انہیں پیار کے ساتھ میرے بندو! کہہ کر ہرگز نہ پکارتا۔ قرآن حکیم میں باری تعالیٰ نے بیس سے زائد مقامات پر گنہ گار انسانوں کو **"عبادی"** (اے میرے بندو!) یا **"یاعبادی"** (اے میرے بندو) کے الفاظ سے خطاب کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:-

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ

فرما دیجئے پیارے نبی! اے میرے گنہ گار بندو (الزمر ۳۹: ۵۳)

مفسرین کرام نے اس آیت مبارکہ کی "یائے نسبت" کو خود آنحضرت ﷺ کی طرف بھی منسوب قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے معنی آیت یوں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ خود نبی کریم ﷺ کو تشریف و محبت کے باعث اپنے گنہ گار انسانوں کو اس طرح خطاب کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں:-

اے میرے گنہ گار غلامو!

جب پکارنے والا کسی کو اس انداز سے پکارتا ہے تو یہ پیار بھرا لہجہ اور محبت آمیز الفاظ بڑے سے بڑے خطاکار اور گنہ گار کو بھی وحشت سے باہر نکال لیتے ہیں اور بجائے خوف سے دور بھاگنے کے، وہ مانوس ہو کر پکارنے والے کے قریب چلا آتا ہے۔ اسی طرح اصلاح کا امکان بھی پیدا ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ' لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم و لجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لھم.

(صحیح السملم' ۲: ۳۵۵)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ تم سے گناہ سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں مٹا کر تمہاری جگہ ایسی قوم لے آئے گا جو گناہ میں بھی مبتلا ہو گی لیکن اس سے بخشش و مغفرت کی طلب گار بھی ہو گی۔ پس اللہ ان کو بخش دے گا۔

فدائے شیوہ رحمت کہ در لباس بہار
بغدر خواہی رندان بادہ نوش آمد

اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے:-

انکسار العاصین احب الی اللہ من صولۃ المطیعین

خدا کو نیکو کاروں کی تمکنت سے گناہگاروں کا عجز و انکسار زیادہ محبوب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رب کائنات کی رحمت و مغفرت کی صفت کو جو مزہ گنہ گاروں کی توبہ قبول کرنے اور انہیں بخشش سے نوازنے میں آتا ہے وہ عبادت گزاروں کی طلب نعمت میں نہیں آتا۔ کیونکہ گنہ گار تو گناہ کے ارتکاب کے بعد بارگہ ایزدی میں شکستہ دل' پژمردہ اور دکھی و شرمسار ہو کر آتے ہیں۔ ان کی نظر خدا کی نعمتوں اور جنتوں پر نہیں بلکہ وہ صرف اپنے رب کی رحمت و مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں اور عبادت گزار خدا کے وعدوں کے مطابق اس کے انعام و اکرام کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس لیے رحمت حق دکھی دلوں' منکسر طبیعتوں اور شرمسار نگاہوں پر نوازش کرتے ہوئے یقیناً جھوم جھوم اٹھتی ہو گی۔

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطان جہاں با ماست امروز

اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:-

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ گناہ سے توبہ کرنے والا اس طرح ہے
(ابن ماجہ ۵۹) جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

یہ کرم جناب ایزدی سے صرف "توبہ و استغفار" کے نتیجے میں نصیب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرور دو عالم ﷺ **معصوم عن الخطاء** ہونے کے باوجود دن میں ستر (۷۰) مرتبہ توبہ و استغفار فرمایا کرتے تھے تاکہ جو انعامات اور الطاف و احسانات، توبہ و استغفار کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان سے بھی بہرہ یاب ہو سکیں۔ رحمت حق کے باعث معصیت کیش یوں پکار اٹھتے ہیں:-

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

خدا کی رحمت کا یہ سارا معاملہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ انسان بھی اپنی شخصیت کو انہی خطوط پر استوار کرے کسی کی زیادتی اسے ناراض نہ کرے بلکہ عفوو درگزر پر آمادہ کرے۔ اگر کوئی شخص بھی تم پر زیادتی نہ کرے تو تمہارے اندر حلم اور عفوو درگزر جیسی اعلیٰ صفات کیسے پیدا ہوں۔ اگر کوئی شخص بھی تمہاری حق تلفی نہ کرے تمہارے اندر معاف کر دینے کا حوصلہ کس طرح پیدا ہو۔ انسان کے اندر یہ صفات تبھی پیدا ہوں گی اگر ان کی ضرورت پیش آئے۔ چنانچہ ایسے احوال میں انسان کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ اس سے اس کی عظمت و حیثیت متعین ہوتی ہے اور کمال نصیب ہوتا ہے۔ گویا **الرحمن الرحیم** کی تعلیم دو مصرعوں میں یوں بیان کی جا سکتی ہے:-

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است   بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

انسان ----- عدالت و امانت کا پیکر

پیغام رحمت کے بعد سورہ فاتحہ انسانوں کو باری تعالیٰ کی شان مالکیت کا تعارف اس کے "جزاو سزا" کے دن کا مالک ہونے کے حوالے سے کرا رہی ہے۔ "یوم

الدین " وہ دن ہے۔ جب ہر نیکوکار اور ہر بدکار کو اپنے اپنے عمل کا صحیح بدلہ جزا اور سزا کی صورت میں میسر آئے گا۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ جو کوئی جس طرز عمل کا صحیح معنوں میں مستحق ہو گا۔ اسے وہی کچھ ملے گا۔ یہ یوم حقیقی معنوں میں "یوم عدل" ہو گا۔ کیونکہ ہر حقدار کو صحیح حق مل جائے۔ ہر شخص کو وہی مقام ملے جس کا وہ حقیقت میں مستحق اور اہل ہے تو اس عمل کو "عدل" کہتے ہیں۔ اگر حقدار کو صحیح مقام نہ ملے یا غیر اہل کو وہ مقام مل جائے جس کا وہ حقدار نہ تھا تو اس کا نام ظلم ہے۔ **لہٰذا** باری تعالیٰ کی یہ صفت تیسری آیت میں بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے عدل کرنے والا ہے۔ ظلم کا کوئی شائبہ اس کی بارگاہ میں موجود نہیں۔ اس لیے ارشاد فرمایا گیا:۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (البقرہ ۲: ۲۸۱)

پھر ہر شخص کو جو کچھ عمل اس نے کیا ہے اسکی پوری پوری جزا دی جائیگی اور ان پر ظلم نہیں ہو گا۔

اس کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی واضح فرما دی ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء ۴۰)

بیشک اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس ۱۰: ۴۴)

بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ ۔۔۔ لوگ (خود ہی) اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کسی پر بھی ظلم نہ ہونے پائے اور ہر ایک سے کمال درجے کا عدل ہو۔ یہ کام ایک کمزور اور محض نرم دل انسان سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے انسان کو قوت و امانت کا حامل بھی ہونا چاہیے۔ وہ اپنی اخلاقی شخصیت کے اعتبار سے اس قدر مضبوط، پختہ اور طاقت ور ہو کہ ظالم کو صحیح انجام تک پہنچا سکے اور مظلوم کی داد رسی بھی کر سکے۔ اس پر کسی کی ناجائز سفارش اور دباؤ اثر انداز نہ ہو سکے،

وہ اپنے مفاد کی خاطر بھی کسی کے ساتھ ظلم نہ کر سکے' وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھی کسی کو نشانہ ستم نہ بننے دے' یہاں صرف "رحمت" نہیں بلکہ رحمت کے ساتھ "قوت وامانت" اور "طاقت سزا" بھی ہونی چاہئے۔ تاکہ وہ حقداروں کو صحیح جزا اور سزا دونوں صلے دے سکے۔ تب ہی "عدالت" کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔

باری تعالیٰ کی یہ صفت "یوم جزا و سزا" کے حوالے سے اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اس دن وہ ذات پکار کے کہے گی "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" (آج کس کی بادشاہی ہے) کوئی متنفس دم نہ مار سکے گا۔ کوئی فرعون سر نہ اٹھا سکے گا۔ کوئی یزید اپنی آمریت کی بات نہ کر سکے گا۔ پھر دربار الٰہی سے خود جواب آئے گا:۔

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (المؤمن '۴۰:۱۶)

صرف اللہ کی بادشاہی ہے جو اکیلا ہے اور قہار یعنی طاقت ور اور زبردست گرفت کرنے والا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ "یوم جزا اور سزا" کا ذکر اب صفت رحمت سے نہیں بلکہ اپنی "وحدانیت و قہاریت" کے حوالے سے کیا ہے تاکہ ظالم و جابر اور خود کو سب سے بڑا حاکم تصور کرنے والے فراعین وقت یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ صرف رحیم ہی ہے۔ لہٰذا آج بھی ہم اس کی رحمت کے باعث اپنے انجام سزا کو پہنچے بغیر چپکے سے نکل جائیں گے یا اس کی رحیمیت ہمیں اپنی گرفت میں لے کر سزا سے ہمکنار نہ کرے گی۔ ظالموں کو اپنے انجام سے باخبر رکھنے کے لیے بتایا جا رہا ہے کہ "میں صاحب رحمت ضرور ہوں لیکن صفت رحمت میری کمزوری نہیں کہ میں عذاب کے حقداروں کو عذاب نہ دے سکوں۔ سن لو! میں جبار و قہار بھی ہوں۔ میری عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ مظلوموں کو جزا اور رحمت ملے اور ظالموں کو سزا اور قہر و غضب' میری ہستی اپنی صفات کے اعتبار سے متوازن ہے غیر متوازن نہیں"۔

اس لیے باری تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کو دو صفات سے متصف کر کے بیان کیا ہے۔ صفت رحمت اور صفت مالکیت و عدالت۔

یعنی میری رحمت اور عدالت دونوں مل کر نظام ربوبیت کو چلا رہی ہیں۔ اگر دونوں میں سے ایک بھی مفقود ہو جائے تو ربوبیت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ سورہ فاتحہ انسان کی شخصیت کی تشکیل کے لیے تیسرا اصول "عدالت اور امانت" کا مہیا کرتی ہے تاکہ وہ صفت رحمت کے باعث محض نرمی کے شعار کو اپنا کر اسے اپنی کمزوری نہ بنا بیٹھے۔ بلکہ رحمت کے ساتھ عدالت کا جوہر بھی ہونا چاہیے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر ظالم و مظلوم' طاقت ور اور کمزور اور مستحق و غیر مستحق کو اپنے اپنے مقام پر رکھ سکے۔ معاملاتِ زندگی اور فرائض منصبی نبھاتے ہوئے نہ کسی طاقتور کی طاقت تمہیں مرعوب کر سکے اور نہ کسی کمزور کی کمزوری متاثر کر سکے۔ عدل کے تقاضے ان تاثرات سے بالاتر ہو کر نبھائے جائیں۔ اسی "عدل" کے تقاضے کو نبھانے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:۔

اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا (النساء' ۴:۱۳۵)

اگرچہ (جس کے خلاف گواہی ہو) مالدار ہے یا محتاج' اللہ ان دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔

یہاں دو ٹوک انداز سے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ نہ کسی امیر کی امارت' دولت مندی اور اثر و رسوخ تمہیں عدل سے انحراف کرنے دے اور نہ کسی غریب کی غربت' بے کسی اور قابل ترس حالت۔ عدل' امیری اور غریبی دونوں حالتوں سے ماوراء ہے۔ یعنی محض ان حالتوں سے متاثر ہو کر عدل نہ کرنا خود ظلم ہے۔ انسان کو اسی ظلم سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اگر انسان کے اندر صرف داعیہ رحم ہو' وہ کسی غریب اور کمزور کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اتنا ترس کھانے لگے کہ اس کے پیش نظر جائز اور ناجائز کا امتیاز نہ رہے اور اس کے اپنے دل پر رقت کی کیفیت اس قدر طاری ہو کہ وہ ضبط نہ کر سکے تو صاف ظاہر ہے ایسا شخص مسند عدالت اور منصب انصاف سنبھالنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ ایسی مسند کے لیے شخصیت اس قدر متوازن ہونی چاہیے کہ وہ رحم اور غضب کے کسی جذبے سے بھی مغلوب نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ماں کی

مانتا ہو یا شفقت پدری ہو اور اپنی غلطی پر اس کا مواخذہ و تادیب نہ ہو تو اس بچے کی صحیح پرورش نہیں ہو سکتی۔ صحیح پرورش کے لیے شفقت اور تادیب دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔ اسی کا نام "عدالت" ہے اور یہی شخصیت کے توازن کا مقصود ہے۔ لہٰذا انسانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ تم بھی یوم جزا و سزا کے مالک کا صحیح بندہ بنو کہ تمہارے اندر جذبات شفقت بھی ہوں اور طاقت انتقام بھی۔ تاکہ مظلوم تمہارے پاس آئے تو اس کی داد رسی ہو اور ظالم تمہارے سامنے آئے تو اپنے عبرتناک انجام کو پہنچے۔ یعنی تم اس شعر کی عملی تصویر نظر آؤ:۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

قرآن کا مرد مومن بھی "قوی و امین" ہے۔ بدھ مت اور جین مت کی تعلیمات کی طرح محض شفیق نہیں کہ وہ شفقت، مستقل کمزوری اور عملی زندگی میں ناکامی کا باعث بن جائے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مرد مومن شفقت و رحمت کا ایسا پیکر ہو کہ طوفانوں کے بھی دل دہل جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پورا کارخانہ ہستی تین معنوی عناصر سے ہی چل رہا ہے۔ ربوبیت، رحمت اور عدالت

اور انہی کا امتزاج انسانی شخصیت کا کمال ہے۔

اگر فطرت کائنات میں پرورش و رحمت کے مجازات ہوں اور مواخذہ ومکافات کا عمل نہ ہو تو کائنات کا یہ حسن اور تزئین و آرائش بھی دکھائی نہ دے۔ اگر دنیائے ہستی میں صرف رحمت کا افادہ وفیضان ہو اور عدالت کا میزان نہ ہو تو نظام حیات درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ جس طرح نظام قدرت کی رعنائیاں اور رنگینیاں رحمت و عدالت دونوں صفتوں کے دم سے ہیں۔ اسی طرح انسانی شخصیت کا حسن وجمال اور توازن و کمال رحمت اور عدالت دونوں کے امتزاج سے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی عنصر مفقود ہو جائے تو شخصیت کی زیب و زینت بھی باقی نہ رہے۔ کیونکہ عدل کی معنی "برابر ہونے" کے ہیں۔ اگر رحمت اور مواخذہ دونوں برابر ہیں تو یہ عدل ہے۔ اگر ان میں

سے ایک بھی کم ہے تو یہ ظلم ہے۔

انسان ---- استغناء اور عزت نفس کا پیکر

انسانی شخصیت کی تشکیل کے لیے مذکورہ بالا تین معنوی عناصر بیان کر لینے کے بعد اب سورہ فاتحہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا انقلاب آفرین اعلان انسان کی زبان سے کرواتی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پوری دنیا کے ناخداؤں اور فرعونوں کے سامنے یہ برملا اعلان کر دے۔ "نہ میرا سر خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھک سکتا ہے اور نہ میرا دست طلب خدا کے سوا کسی اور کے سامنے دراز ہو سکتا ہے"۔

یہاں پہنچ کر انسان زبردست انقلابی شخصیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ اس کی زبان سے اپنے رب عظیم کے حضور یہ اقرار کرواتی ہے کہ "اے باری تعالٰی! میں پوری زندگی میں تیرے سوا نہ کسی کے خوف سے جبین نیاز جھکاؤں گا اور نہ کسی لالچ کے باعث، کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آمر و مقتدر کیوں نہ ہو، کتنا ہی بڑا نمرود و فرعون کیوں نہ ہو، کتنا ہی مضبوط حکمران کیوں نہ ہو۔ میرا سر تو کٹ سکتا ہے۔ اس کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ میں نے تیری بندگی اختیار کی ہے۔ اس میں کسی اور کو کسی حال میں بھی شریک نہیں کروں گا۔ اسی طرح دنیا کے بڑے سے بڑے قارون کے سامنے بھی میرا دامن سوال دراز نہیں ہو سکتا۔ میری موت تو واقع ہو سکتی ہے، متاع ضمیر نہیں بک سکتی۔ اے اللہ! میں تیرے سوا، دنیا کی ہر طاقت سے مستغنی ہوں۔ یہی میری بندگی ہے اور یہی میری زندگی"۔

عبادت و استعانت کا یہ اخلاص انسان کو استغناء اور عزت نفس کی دولت عطا کرتا ہے۔ آیئے ہم سورہ فاتحہ کی تلاوت کے دوران کیے جانے والے اس اقرار کی روشنی میں ذرا زندگی کا جائزہ لیں، اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اپنے احوال کو پرکھیں ---- کیا ہم خدا کو چھوڑ کر خواہش اور حرص و لالچ کے ہزاروں بتوں کی پوجا نہیں کرتے؟ کیا ہم ہر جابر کے خوف سے اس کی چوکھٹ پر جبین نیاز خم نہیں کرتے؟ کیا ہم

مفادات کی خاطر لاکھوں ناخداؤں کی بندگی اور غلامی نہیں کرتے؟ کیا ہم معمولی سے معمولی منفعت کی خاطر ضمیر فروشی نہیں کرتے؟ کیا ہم ہر اس دروازے پر ذلت و رسوائی کا پیکر بن کے سوال نہیں کرتے جہاں سے ہمیں کچھ ملنے کی امید ہو۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو عزت کی موت کو ذلت و رسوائی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں؟ ہم میں سے کتنے ہیں جو عزت کی غریبی کو بے غیرتی کی دولتمندی پر ترجیح دیتے ہیں؟ ہم میں سے کتنے ہیں جو حقیقی وقار و تمکنت کو جھوٹی جاہ و حشمت پر ترجیح دیتے ہیں؟ ہم میں سے کتنے ہیں جو روح کے سکون کو جسم کے سکون پر' اور دل کی طمانیت کو زندگی کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے ہیں؟

کیا ہم اپنی ملازمتوں' تجارتوں' کاروباروں اور دیگر معاملات زندگی میں غیروں کی بندگی نہیں کرتے؟ یہ حرام خوری کے سب ذرائع' رشوت و غبن کی سب صورتیں' حصول دولت اور کثرت منافع کے سب ناروا ڈھنگ' خدا کی بندگی اور اس سے استعانت کے خلاف کھلی بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟ پارسائی کے بڑے بڑے دعوے کرنے والو! لوگوں کی رہنمائی اور قیادت کے مسند سجانے والو! اپنے شب و روز' خلوت و جلوت' سفر و حضر' طعام و قیام الغرض اپنے جملہ احوال حیات اور ذرائع آمدن پر نظر ڈال کر بارگاہ ایزدی میں جواب دو۔ یہ سب کہاں سے آیا ہے؟ اور کس طرح آیا؟ ایمانداری سے یا بے ایمانی سے' دیانتداری سے یا بددیانتی سے' خلق خدا سے ہمدردی کے ذریعے یا ان کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعے' ملک و ملت کے سرمائے کو امانت سمجھتے ہوئے یا اسے غصب کرتے ہوئے' خدا کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے یا ان کا کھلا انکار کرتے ہوئے؟

اگر تم اپنے رب کی صحیح معنوں میں بندگی کرتے تو کیا انسانوں کے احوال زندگی میں اس قدر غیر فطری تفاوت ہوتا؟ یہ تفاوت اور طبقاتی تفریق پر مشتمل معیار حیات جسے تم نے خدا کی مرضی اور اس کی تقدیر کا نام دے رکھا ہے یہ نہ اس کی مرضی ہے اور نہ اس کی تقدیر۔ بلکہ اس کے عطا کردہ وسائل و اختیارات کا ناجائز استعمال ہے'

اس کے عطا کردہ ذرائع رزق پر ناجائز تصرف ہے اور اس کے تسلیم کردہ نظام عدل ومساوات سے صریح انحراف ہے۔ بقول شخصے:-

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

کیا خدا کی مرضی یہی ہے کہ کسی کے ایک کتے کے اخراجات سینکڑوں انسانوں پر مشتمل کنبوں کی ضروریات سے بھی زائد ہوں؟ اس غیر انسانی فعل کو خدا کی مرضی اور اس کی تقدیر کا نام دینا، گویا یہ کہنے کے مترادف ہے کہ کیا ایسا خدا (معاذ اللہ) اس قابل ہے کہ اسے تمام انسانوں کا رب اور رحمان و رحیم مانا جائے؟ اندریں صورت جواب نفی میں ہی آئے گا۔ زندگی کا یہ تصور اور یہ عمل خدا کے ساتھ کفر اور اس کی بندگی کے ساتھ کھلا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟۔

آیئے ہم اس منافقت سے توبہ کریں اور خود کو باری تعالیٰ کا سچا بندہ ثابت کریں۔ تاکہ انسانی معاشرے میں انسانی شرف و وقار صحیح طور پر بحال ہو سکے۔

انسان ----- تواضع اور نیاز مندی کا پیکر

سورہ فاتحہ انسانی شخصیت کی صحیح تشکیل کے لیے اسے استغناء اور عزت نفس کی تعلیم دے کر اب تواضع اور نیاز کا درس دے رہی ہے۔ استغناء کی تعلیم اس لیے دی گئی تھی کہ انسان کے کسی عمل سے انسانی شرف مجروح نہ ہونے پائے اور وہ ہر حال میں اپنے ضمیر کو زندہ رکھے۔ اس تصور کی جھلک علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے:-

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے ذریعے انسان کو بارگہ ایزدی میں سراسر تواضع اور نیازی مندی کا پیکر بننے کا سبق دیا جا رہا ہے تاکہ انسان کے اندر استغناء کا تصور رفتہ رفتہ غرور و تکبر میں نہ بدل جائے۔ کیونکہ استغناء اور تکبر کی سرحدیں کہیں قریب ہو جاتی ہیں۔ جن کے درمیان موجود فرق کو بہر طور پیش نظر رہنا چاہئے۔ عدم التفات اور بے پرواہی کا وطیرہ اگر فرعون صفت' طاقتور اور ظالم و جابر افراد کے ساتھ روا رکھا جائے تو اس کا نام "استغناء" ہے۔ اس کے برعکس یہی وطیرہ کمزور' غریب اور بے کس و مظلوم افراد کے ساتھ روا رکھا جائے تو اس کا نام "تکبر" ہے۔ کیونکہ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

التکبر مع المتکبرین عبادۃ — متکبر افراد کے ساتھ تکبر کرنا عبادت ہے

گویا متکبر افراد سے استغناء نیکی ہے اور کمزور افراد سے استغناء گناہ عظیم ہے۔ پہلا استغناء انسانی عزت کی علامت ہے اور دوسرا انسانی ذلت کی۔ اس امتیاز کو ملحوظ رکھے بغیر انسان معاشرتی سطح پر نیکی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے ذریعے انسان بارگہ الوہیت میں سراپا عجز و سوال بن جاتا ہے اور بزبان خود اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اے باری تعالیٰ! میرا فہم و ادراک اور قابلیت و صلاحیت اس لائق نہیں کہ میں دنیا میں حق و راست پر مبنی زندگی بسر کر سکوں اور منزل مقصود کو پا سکوں' میں محض عاجز و بے کس ہوں۔ میری سوچ خطا کے سوا کچھ نہیں' بس صرف تو ہی ہے جو مجھے راہ راست پر لا سکتا ہے اور صحیح زندگی کی دولت سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔ تو ہی مجھے عزت و وقار عطا کرنے والا ہے اور تو ہی مجھے ہر قدم پر کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ جب انسان ہر گھڑی اپنے ظاہر و باطن میں اس حقیقت کا اعتراف کرے گا اور ذات حق سے یہ التجا کرے گا تو اس کے اندر کس قدر تواضع' انکسار اور نیاز مندی پیدا ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ بندگی کی عظمت یہی ہے کہ بندہ خود کو خدا کی بارگاہ میں عاجز و ناتواں سمجھے۔ جو شخص حضور الوہیت میں جس قدر جھکتا جائے گا' اسی قدر بلند ہوتا جائے گا' جو بارگاہ خداوندی میں جس قدر عجز و نیاز اور گریہ و زاری کرے گا' اسی قدر قوی

اور مستقیم ہو جائے گا کیونکہ عبدیت کی انتہا عنایات کی [illegible] ہے۔ اسی [illegible] ہی بندے پر خدا کی عطاؤں کے دروازے کھلتے ہیں اور اسے جناب ایزدی سے بزرگی کا تاج نصیب ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک طرف فاتحہ الکتاب انسان کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکنا اور نہ ہی کسی کے آگے سائل بننا ہے اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ خدا کے سامنے تیری حالت کیا ہونی چاہئے۔ خدا کی بارگاہ وہ جگہ نہیں جہاں تو استغناء کا وطیرہ اختیار کرے۔ یہاں سراپا سوالی بن جا۔ اس کے حضور، اپنی طاقت اور صلاحیت پر بھروسہ نہ کر۔ اس کی عطاؤں سے مستغنی نہ ہو، بلکہ ہر حال میں اسی سے ہدایت کی بھیک مانگ۔ اگر اس کی بارگاہ میں تیری طلب کا دامن دراز رہے تو اس کی نوازشوں کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ انحصار تیرے حسن طلب اور ظرف پر ہے ورنہ اس کے یہاں کوئی کمی نہیں۔ اس کی عطا تو ہر گھڑی پکار پکار کر کہہ رہی ہے:۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

یہی وہ طرز عمل ہے جو انسان کو خدا کی عنایات کا مستحق بناتا ہے اور اسے صحیح معنوں میں آداب بندگی سے آشنا کرتا ہے۔ اسی لیے انسان کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ زندگی کو بجائے اپنی پسند اور خواہش کے مطابق گزارنے کے، اپنے رب کریم جل جلالہ، کی رضا اور خوشنودی کے مطابق گزارے۔ یہی تقاضائے ایمان ہے اور یہی شرط بندگی ہے۔ لیکن ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہم خدا سے طرز زندگی کی ہدایت مانگ کر کس حد تک اس کی مہیا کردہ ہدایت کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اگر ہماری نظر اپنی دعا اور اپنے عمل کے تضاد پر پڑ جائے تو ہم عمر بھر شرم و ندامت میں غرق رہیں۔ ہم نے باری تعالیٰ سے ہدایت طلب کی تھی، سو اس نے اپنی کتاب، اپنے برگزیدہ انبیاء اور اپنے صالح بندوں کے ذریعے ہمیں ہدایت کر دی، ہمیں زندگی بسر کرنے کا ضابطہ عطا کر دیا، ہمارے سامنے نمونہ کمال اور معیار عمل سب کچھ پیش کر

دیا۔ فکر و عمل کے اعلیٰ نمونے ہمیں مہیا کر دیئے۔ اس کے بعد اب ہمارا کام ہے کہ ہم اپنی زندگی کو خواہشات نفس، حرص و لالچ اور محدود مفادات کے حصار سے نکال کر اسے اس طرز پر ڈھالیں جس کی ہمیں ہدایت کی گئی ہے۔ اگر ہدایت کی طلب کر کے بھی ہم ہدایت ربانی کی روشنی میں اپنے اندر انقلاب بپا نہ کر سکیں تو اس سے بڑھ کر دھوکہ اور منافقت کا عالم کیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے زندگی کے ہر قول و عمل کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ نہ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں؟ اس قول کے تقاضے کیا ہیں؟ وہ کس طرح نبھائے جائیں گے؟ ہم کر کیا رہے ہیں؟ اور اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

کاش ہم نے اپنی زندگی کو ایک حقیقت سمجھا ہوتا اور اس کو سنوارنے کے لیے ہم سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہوئے ہوتے۔ پھر اخلاقی انحطاط و زوال کی یہ صورت نہ ہوتی۔ ہم میں سے بیشتر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کے بہت سے امور، رسم و رواج اور احوال غلط ہیں۔ وہ قائم نہیں رہنے چاہیں۔ لیکن ہر شخص خود کو بلاوجہ مجبور بنا کر ان کے کیے جانے پر عملاً مصر بھی ہے۔ ہدایت محض اس چیز کا نام نہیں کہ بعض امور کو اچھا اور بعض کو برا سمجھا جائے بلکہ ہدایت یہ ہے کہ اچھے امور بہر طور سر انجام دیئے جائیں اور برے امور سے بہر طور پرہیز کی جائے۔ اس جرأتمندانہ عملی اقدام کے بغیر ہدایت رواج نہیں پا سکتی۔ اس کے لیے قربانی دینا پڑتی ہے خواہ لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند۔ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے فیصلے کا حق در حقیقت خدا اور اس کے رسول ﷺ کو ہے لوگوں کو نہیں۔ بد قسمتی سے جو احوال عملاً زندگی میں پیدا کرنے کے قابل تھے۔ وہ اب ہماری مجلسی زندگی کے بعض موضوعات اور خطبوں کے عنوانات بن کر رہ گئے ہیں۔ ان پر تقریریں ہوتی ہیں۔ مذاکرے ہوتے ہیں۔ تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ الغرض سب کچھ ہوتا ہے لیکن عمل نہیں ہوتا۔

آیئے! **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** کی حقیقی روح کو سمجھتے ہوئے اسے عملی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کریں تاکہ کفر و طاغوت کے سب تراشیدہ بت پاش

پاش ہو جائیں اور انسان فی الواقع خدا کا بندہ بن جائے۔

انسان ----- اعتدال اور توازن کا پیکر

اب سورہ فاتحہ میں المستقیم کے لفظ کے ذریعے انسانی شخصیت کو اعتدال اور توسط و توازن کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

(الفاتحہ' ۱:۵)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں سیدھی راہ کونسی ہے۔ جس کا جواب۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔

کی صورت میں دیا گیا ہے۔ یہاں بات اس قدر واضح ہو گئی کہ سیدھی راہ وہ ہے جو انسانوں کے لیے باعث نعمت ہے۔ گویا سیدھی راہ اپنانے سے انسان وبال وعذاب کی صورتوں سے بچ جاتا ہے اور خدا کے دامن عافیت میں رہتا ہے۔ یہی اس کی نعمت ہے۔ اس کے بعد حصول نعمت کی راہ کو دو شرائط کے حوالے سے مزید اجاگر کر دیا گیا ہے:-

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ (ہی) گمراہوں کا۔

(الفاتحہ' ۱:۷)

اگر مذکورہ بالا دونوں آیات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ راستے تین قسم کے بیان ہوئے ہیں:-

۱۔ نعمت کا راستہ ------------ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

۲۔ غضب کا راستہ ------------ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

۳۔ اور ضلالت کا راستہ ---------- وَلَا الضَّآلِّيْنَ

جو راستہ باعث نعمت قرار دیا گیا ہے وہ درمیانی راستہ ہے کیونکہ کسی کی مخالفت دو سمتوں میں ہوا کرتی ہے ایک افراط کی سمت میں اور دوسری تفریط کی سمت میں۔ افراط اور تفریط دونوں سے بچاؤ اعتدال اور توازن کے راستہ میں ممکن ہے۔ چنانچہ اس کا نام راہ نعمت ہے۔ سورہ فاتحہ کی اصطلاح میں جو راستہ افراط پر مبنی ہے اسے راہ غضب اور جو تفریط پر مبنی ہے اسے راہ ضلالت کہیں گے۔ اسی لیے سورہ فاتحہ میں **صراط مستقیم** کی تعریف کرتے ہوئے دو راستوں کی نفی اور مذمت کی گئی ہے۔ ایک راستہ وہ ہے جس پر چلنے سے انسان خدا کے غضب کا شکار ہوتا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس میں حد سے آگے بڑھا جائے۔ دوسرا وہ جس پر چلنے سے انسان گمراہ رہتا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان مطلوبہ حد تک بھی نہ پہنچ سکے۔ **المستقیم** کا لفظ "سیدھی راہ" پر دلالت کرتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ سیدھی راہ پر چلتے ہوئے بھٹکنے کے دو ہی امکانات ہوتے ہیں۔ دائیں یا بائیں۔ دونوں غلط راستوں کے درمیان کی راہ جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط "درمیانی راہ" ہے اور یہی امت محمدیہ کا طرہ امتیاز بیان کیا گیا ہے:-

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

(البقرہ '۲: ۱۴۳)

اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

سورہ فاتحہ انسان کو افراط و تفریط کے راستوں سے بچ کر اعتدال کی درمیانی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کر رہی ہے اور یہ ندا دیتی ہے کہ راہ حق کے متلاشیو! اگر تم درمیانی سیدھی راہ پر گامزن رہو گے تو خدا کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرو گے اگر حد سے تجاوز کر کے افراط کا شکار ہو گے تو خدا کے قہر و غضب کے مستحق ٹھہرو گے۔ اگر تفریط کی راہ پر گامزن رہو گے تو گمراہی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے پھرو گے۔ اپنی زندگی کے جملہ امور کو دونوں طرف کی انتہا پسندی سے بچاتے ہوئے اعتدال و توازن اور میانہ روی کی راہ اختیار کر لو تاکہ منزل مقصود کو پا سکو۔

یہ تعلیم در حقیقت قرآنی تعلیمات کا نچوڑ ہے کیونکہ انسانی شخصیت عام طور پر اسی مسئلے کے باعث غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ یا تو کوئی صفت اس میں سرے سے پائی نہیں جاتی، اگر پائی جاتی ہے تو ضروری حد سے کم یا زیادہ، اور بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر مختلف صفات و عادات کا امتزاج اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی کسی پر غالب اور کوئی مغلوب۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ صفات کا باہمی ملاپ اعتدال کے اصول پر ہو۔ اگر انسانی جسم کے اعضاء و جوارح کے باہمی تناسب میں اعتدال ہو تو یہ اخلاقی اور باطنی حسن قرار پا جاتا ہے۔ گویا حسن و جمال کی حقیقی اساس بھی "اعتدال" ہی ہے۔ خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔

چنانچہ قرآن مجید انسانی شخصیت کو ہر لحاظ سے حسین و جمیل بنانے کا جو نسخہ کیمیا تجویز کرتا ہے۔ وہ "نسخہ اعتدال" ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:-

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ — میانہ چال چل اور اپنی آواز کچھ پست رکھ (لقمان، ۳۱:۱۹)

اس آیت میں رفتار و گفتار دونوں امور میں اعتدال کا حکم دیا گیا ہے۔ چلنا پھرنا اور کلام کرنا انسانی زندگی کے ایسے عمل ہیں کہ ان سے کسی طرح بھی فرار ممکن نہیں۔ قرآن ان میں بھی واضح طور پر افراط و تفریط سے بچاؤ اور توازن کی تلقین کرتا ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کے بارے میں ارشاد ایزدی ہے:-

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ — کھاؤ اور پیو اور حد سے زیادہ خرچ نہ کرو کہ بے شک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ (اعراف، ۷:۳۱)

مزید برآں "انفاق" (خدا کی راہ میں مال خرچ کرنا) ایسا عمل ہے کہ اس کے بغیر نیکی ممکن نہیں لیکن اس میں بھی افراط و تفریط سے اجتناب اور اعتدال و توازن کا حکم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ — اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں خرچ

يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا

(الفرقان ۲۵:۶۷)

... کرتے ہیں ... اسراف یعنی افراط کرتے ہیں اور نہ بخل یعنی تفریط، بلکہ دونوں حالتوں کے درمیان حالت اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ

(بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن پر بندھا ہوا رکھو (کہ کسی کو کچھ نہ دو) اور نہ ہی اسے سارا کا سارا کھول دو (کہ سب کچھ ہی دے ڈالو)

یعنی مال کو خرچ کرنے میں نہ بخل کرو اور نہ اسراف کیونکہ دونوں عمل منشائے ایزدی کے خلاف ہیں۔ ہر چند کہ نیکی "محض اس عمل کو کہتے ہیں جو حکم الٰہی کی اطاعت کی نیت سے صادر ہوا ہو"۔ اگر نیت اطاعت حکم الٰہی کی نہ ہو تو وہ عمل شرعاً نیکی قرار نہیں پا سکتا۔ خواہ ظاہراً وہ عمل کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ عمل نیکی اس وقت تک رہتا ہے۔ جب تک اس کی حدود صحت ملحوظ ہوں۔ حدود صحت سے مراد یہاں یہ ہے کہ وہ عمل دو انتہائی حدوں کے درمیان ہو۔ افراط سے کم ہو اور تفریط سے زیادہ۔ یعنی نقطۂ اعتدال کو قائم رکھا جائے۔ بعض امور میں اسلامی احکام ظاہراً انتہائی حد پر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھی فی الحقیقت افراط نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس عمل کی علل و نتائج اور متعلقات کے لحاظ سے وہی مقام جسے ہم غلط فہمی کی بناء پر انتہائی حد سمجھتے ہیں، اس کا نقطۂ اعتدال ہوتا ہے۔ اعتدال ایک اضافی امر ہے۔ اس لیے اسے ہر عمل کے سیاق سے سباق کو جانچا جانا چاہیے۔

قرآن مجید نے صرف "صراط مستقیم" کی تعریف میں اس کے بنیادی تصور کو بیان کیا ہے کہ نہ "افراط" ہو اور نہ "تفریط"۔ یعنی نہ راہ غضب ہو اور نہ راہ ضلالت۔ بلکہ درمیانی راہ ہو جو راہ نعمت ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر "ظلم"، "طغیان"، "اسراف"، "تبذیر"، "فساد"، "اعتداء"، اور "عدوان" وغیرہ کی مذمت آئی ہے۔

ان میں سے ہر لفظ کے معنی پر غور کیا جائے تو تینوں میں ایک ہی مفہوم کی نشاندہی ہوتی ہے اور وہ ہے "خلاف عدل" یعنی "منافی اعتدال" ہر ایک میں اپنی حد سے ہٹ جانے' اپنی جگہ سے گزر جانے یا کسی چیز کے بے جا اور بے محل استعمال ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ الفاظ جن حالتوں کو بیان کرتے ہیں۔ وہ سب حالت اعتدال سے باہر اور اس کے منافی ہیں۔

جو چیز زیادہ سے زیادہ جس حد تک مطلوب ہو۔ اگر انسانی عمل اس سے آگے بڑھ جائے تو یہ بھی ناپسندیدہ ہے اور جو چیز کم سے کم جس حد تک مقصود ہو۔ عمل اس سے نیچے رہ جائے تو بھی نامقبول ہوتا ہے۔ اس لیے سورہ فاتحہ نے انسانی شخصیت کو بہتر خطوط پر استوار کرنے کے لیے اسے ہر معاملے میں راہ اعتدال تجویز کی ہے تاکہ انسان افراط اور تفریط' دونوں کی خرابیوں سے محفوظ رہے۔ کیونکہ قرآنی فلسفہ یہی ہے کہ برائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ حقیقت عدل سے انحراف ہو۔ یہاں تک کہ "شرک" جو گناہ عظیم ہے' بھی عقیدے میں اعتدال سے انحراف ہی کا نام ہے۔ شان مخلوق میں افراط ہو یا شان الوہیت میں تفریط دونوں صورتیں شرک کو جنم دیتی ہیں۔ یہ منشاء قدرت صرف اعمال و افعال یا عقائد و نظریات پر ہی موقوف نہیں بلکہ سارے کارخانہ ہستی کا نظام ہی اعتدال کے اصول پر قائم ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے اجرام فلکی' نظام شمسی کے ارکان اور متحرکات عالم اپنی اپنی حرکت میں راہ عدل سے ہٹ جائیں تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے۔ انسانی صحت ہو یا خوبصورتی' حسن نباتات ہو یا دلفریبی عمارات' نغمات کے الفاظ و تراکیب ہو یا ان کی صوتی حلاوت و دلکشی' یہ سب کچھ کیا ہے؟ صرف تناسب و اعتدال ہی کا کرشمہ ہے۔ اگر یہ کیفیت قائم ہے تو حسن و جمال اور رنگینی و دلفریبی بھی قائم ہے۔ اگر یہ مختل ہو جائے تو کچھ بھی باقی نہ بچے۔ بس یہی معاملہ انسانی عقیدہ و عمل کا بھی ہے۔ اعتدال کی حالت قائم رہے تو عقیدہ و عمل سب درست ہیں۔ اگر حالت اعتدال سے انحراف ہو جائے تو اسی کا نام بدعقیدگی اور بداعمالی ہے۔ لہٰذا اعتدال ہو تو شخصیت متوازن' ورنہ غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ جو کسی حال میں بھی پسند نہیں کی جا سکتی۔

انسان------ حق و باطل میں واضح امتیاز کا پیکر

آخری نکتہ جو سورہ فاتحہ انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کے باب میں واضح کرتی ہے وہ "حق و باطل کے درمیان امتیاز کا ہر سطح پر قائم رکھنا ہے۔"

سورہ فاتحہ کی آخری دو آیات میں انسان کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ اس کارگہ زیست میں اول سے آخر تک دو ہی راستے معرض وجود میں رہے ہیں۔ راہ حق اور راہ باطل 'ایک سچائی اور نیکی کی راہ' دوسری جھوٹ اور برائی کی راہ۔ ہدایت ربانی شروع سے ہی اسی امتیاز کو اجاگر کرنے کے لئے نازل ہوتی رہی ہے کہ انسان صدق و کذب' خیر و شر' نیکی و بدی اور حق و باطل کے درمیان فرق کو زندگی کی ہر سطح اور ہر معاملے میں پہچان لے اور اپنے لئے راہ حق کو منتخب کر سکے۔ آفرینش عالم سے انسانی طبقات کے درمیان جب بھی جنگ و جدال اور تضاد و تصادم کی کیفیت پیدا ہوئی ہے اس میں حق و باطل کے امتیاز کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے بلکہ یہی تصور ہر اختلاف اور تصادم کی بنیاد بنتا رہا ہے۔ انسان نے حق و باطل کے تعین میں ٹھوکریں ضرور کھائی ہیں لیکن اس کے شعور سے دستبردار نہیں ہو سکا۔ کبھی ذاتی مفادات کا نام حق رکھ دیا گیا' کبھی گروہی اور طبقاتی وفاداریاں حق تصور کی گئیں' کبھی نسلی و علاقائی تشخصات حق کے نام سے معروف ہوئے' کبھی حق رسم و رواج اور مذہبی حمیت کے روپ میں منظر عام پر آیا اور کبھی دیگر تعصبات کے رنگ میں' کبھی حقوق انسانی کی بحالی اور شرف و تکریم انسانیت کا تحفظ حق کا مسئلہ بنا رہا' کبھی ظلم و استحصال کی مخالفت و مزاحمت' الغرض صحیح یا غلط' ہر انداز میں حق اور باطل کے نام پر انسانی قوتیں تاریخ عالم میں ہمیشہ برسرپیکار رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔ یہ امتیاز اس لئے ہمیشہ قائم رہا ہے کہ حق و باطل کے امتیاز کا شعور فطرت انسانی میں ہی اصلاً ودیعت کر دیا گیا ہے مگر اصل مسئلہ جو ہدایت ربانی کا موضوع تھا اور آج بھی ہے' یہ ہے کہ حق و باطل کا صحیح تعین کس طرح ہو اور ان کے درمیان امتیاز کی صحیح بنیاد کیسے طے کی جائے تاکہ انسان حق اور باطل کے

مفہوم کو متعین کرتے ہوئے ذاتی مفاد و محبت یا عداوت و نفرت کو پیش نظر نہ رکھے۔

سورہ فاتحہ کے اسلوب بیان پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں صرف حق و باطل کے دو راستے ہی بیان نہیں کئے گئے اور نہ ہی صرف ان کے امتیاز کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے بلکہ دو ٹوک اور واضح انداز سے یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ زندگی میں راہ حق کو اپنانے سے خدا کی نعمت اور راہ باطل کو اپنانے سے خدا کا غضب اور گمراہی و ضلالت نصیب ہوتی ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں تو آپ کو علم ہو جائے گا کہ حق و باطل کے درمیان امتیاز قائم کرنے کا یہ حکم طلب ہدایت کی دعا کے جواب میں دیا گیا ہے۔ جب انسان خدا سے سیدھی راہ اور استقامت کی ہدایت مانگتا ہے تو اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○

(الفاتحہ '۱: ۷-۶)

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا' ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ (ہی) گمراہوں کا۔

گویا قرآن کی رو سے ہدایت یہی ہے کہ صدق و کذب' خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان ہر سطح پر امتیاز قائم رکھا جائے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہدایت حق و باطل کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنے کا نام ہے اور گمراہی' حق و باطل کے درمیان سمجھوتے کا۔ نیکی و بدی اور اچھائی و برائی کے درمیان جس سمجھوتے کا نام ہم نے رواداری' حکمت اور مصلحت رکھ دیا ہے وہ نہ رواداری ہے اور نہ حکمت و مصلحت' بلکہ اس کا نام گمراہی' منافقت اور بے ضمیری ہے کیونکہ ہدایت' ایمان اور ضمیر سب کی آواز ایک ہی ہے کہ حق باطل سے اور باطل حق سے متمیز نظر آئے۔ یہی حقیقی سعادت اور کامیابی ہے۔ اگر آپ کے قدم شاہراہ حیات پر ڈگمگا گئے' راستبازی کو اخلاص کے ساتھ اپنے اندر قائم نہ رکھ سکے۔ اس میں اپنے مفادات کا دخل آ گیا' باطل کی آمیزش ہو گئی اور شخصیت دوہرے پن کا شکار ہو گئی تو اسی کا نام محرومی' شقاوت اور ناکامی ہے۔ اہل سعادت دنیا میں چلنے والی ہوا و ہوس کی تیز و تند آندھیوں کے باوجود ثابت قدم

رہتے ہیں مشکلات و مصائب کے باوجود کذب و منافقت کی آمیزش اپنے کردار میں نہیں ہونے دیتے اور ہر قربانی دے کر بھی حق ہی کے علمبردار رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل شقاوت قدم قدم پر بھٹکتے اور ڈگمگاتے ہیں، کذب و باطل کے ساتھ سمجھوتے کا نام بصیرت و حکمت رکھتے ہیں اور اپنے کردار میں خیر و نیکی کی خالصیت برقرار نہیں رکھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلا طرز عمل کامیابی و کامرانی اور دوسرا طرز عمل ناکامی و نامرادی ہے۔ اگر اہل سعادت کی راہ ثابت قدمی سے اپنائی جائے تو آج اخلاقی انحطاط کے انتہائی دور میں بھی زندگی معروضی نتائج سے خالی نہیں ہو سکتی۔ نتائج کا پیدا نہ ہونا فی الواقع ہمارے عمل کے نقص کے باعث ہوتا ہے۔ جب ہم ظاہراً راہ صدق کو اپنا کر نتائج پیدا نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں تو ہمیں بجائے نظام کائنات، بزم حیات اور مشیت ایزدی کا شکوہ کرنے کے دوبارہ اپنے دامن سیرت پر نظر کرنی چاہئے کہ کہیں کوئی نامعلوم سا دھبہ تو دکھائی نہیں دے رہا۔ سچ یہ ہے کہ حق اور صدق کی راہ کلی ہوتی ہے جزوی نہیں، عملی ہوتی ہے محض نظری نہیں۔ ہمارے معمولات کا یہ عالم ہے کہ ہم اگر حق کو اپناتے ہیں تو وہ بھی جزوی طور پر، کسی ایک معاملے میں ہماری سوچ اور عمل صحیح ہوتا ہے یا چند امور میں ہم صحیح عمل کرتے ہیں مگر دیگر کئی معاملات میں ہم حق کی آواز سے اپنے کانوں کو بند کئے ہوئے رہتے ہیں۔ حق شخصیت کے اندر کلی اور ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے۔ جزوی تبدیلی کا نہیں۔ کچھ امور صحیح عمل کے آئینہ دار ہوں اور کچھ غلط عمل کے تو اس طرح شخصیت دوئی کا شکار ہو کر بے اثر ہو جاتی ہے اسی کا نام حق و باطل کی آمیزش ہے اور یہی کردار کی منافقت ہے۔ شخصیت کے اندر حق خالصتاً جاگزیں ہو تو اسے "ایمان" کہتے ہیں۔ باطل خالصتاً جاگزیں ہو تو اسے "کفر" کہتے ہیں اور حق و باطل کے رجحانات ملے جلے ہوں یعنی دونوں کی آمیزش ہو تو اسے "منافقت" کہتے ہیں۔ قرآن مجید نتائج پیدا کرنے کے لئے شرط "حالت ایمان" کو قرار دیتا ہے منافقت کو نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ — اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران‘ ۳:۱۳۹)

اس لئے اہل ایمان کو حکم دیا گیا۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً — اے ایمان والو! اسلام یعنی حق کے عمل میں کلی طور پر داخل ہو جاؤ۔ (البقرہ‘ ۲:۲۰۸)

اگر مذکورہ بالا امر پیش نظر نہ ہو تو "اہل ایمان کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔" یہاں اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایمان لانے کے بعد باطل کے تمام رجحانات کو ترک کر دیا جائے‘ جھوٹ اور برائی کے تمام مفادات و معاملات سے جدا ہوا جائے‘ ہر قدم پر حق پرستی اور راستبازی کا شیوہ اپنایا جائے۔

اگر دعوئ ایمان کے باوجود یہ جرأت رندانہ پیدا نہیں ہوتی اور انسان حق کی خاطر باطل کے دائرے سے کلیتاً خارج نہیں ہو جاتا تو اس دعوے کی حیثیت محض دھوکے اور دجل و فریب کی سی رہ جاتی ہے۔ یہ آیت مبارکہ انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہے کہ

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سورہ فاتحہ نے اپنے ابدی پیغام کے ذریعے انسانوں کو یہی تعلیم دی ہے کہ اہل سعادت اور اہل نعمت کی راہ کو اپناؤ‘ اہل غضب اور اہل ضلالت کی راہ کو نہیں۔ اگر تمہاری زندگی حق و باطل اور سعادت و شقاوت کے درمیان امتیاز کا عملی پیکر ہے تو یہی ہدایت و استقامت ہے۔ اگر اس منزل پر تمہارے قدم لڑ گئے اور تم دونوں راستوں کو خلط ملط کر بیٹھے تو یہی گمراہی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے شب و روز پر نظر ڈالتے ہوئے اپنا تجزیہ کریں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ہمارا طرز عمل کیا ہے؟

ایمان، کفر یا منافقت؟ ہم میں سے کتنوں کی خلوت، جلوت سے مختلف ہے۔ عمل قول سے متصادم ہے۔ کردار، پیغام سے متضاد ہے، سیرت، فکر سے الگ ہے۔ رات، دن سے ہم آہنگ نہیں۔ نجی زندگی، مجلسی زندگی سے سازگار نہیں۔ الغرض ہم قدم قدم پر تضاد اور دوئی کا پیکر ہیں۔ سیرت و کردار کی یہ منافقت ہی ہماری زندگی میں نتائج پیدا کرنے میں رکاوٹ ہے۔

فاعتبروا یااولی الابصار

اب ذرا غور کیجئے اگر سورہ فاتحہ کی ان تعلیمات کے سانچے میں کوئی شخصیت ڈھل کر نکلے تو کتنی اثر انگیز اور انقلاب آفریں ہو گی۔ یہی فکر و عمل کے وہ پیمانے ہیں جن پر قرآن انسانی شخصیت کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ خدا کرے سورہ فاتحہ کی یہ دعا، عمل بن کر ہماری شخصیتوں میں وہی تبدیلی پیدا کر سکے جس کی آرزو سورہ فاتحہ کی دعا کی صورت میں کی گئی ہے۔

باب-۱۷

سورہ فاتحہ
اور
تعلیمات طریقت

سورہ فاتحہ اور تعلیمات طریقت

شریعت اور طریقت کا باہمی تعلق کل اور جزو کے تعلق کی مانند ہے۔ شریعت حقیقت میں کل کا درجہ رکھتی ہے اور طریقت اس کا ایک جزو ہے۔ شریعت بنیادی طور پر تین قسم کے علوم کا مجموعہ ہے:-

۱۔ **علم العقائد** -------- یہ علم انسانی عقائد و نظریات سے بحث کرتا ہے۔ ایمان کے تمام علمی تقاضوں کی تفصیل مہیا کرتا ہے اور باطل خیالات و تصورات کی تردید کرتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ”**الفوز الکبیر**“ میں ”**علم المخاصمہ**“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی علم کلام کا موضوع ہے۔

۲۔ **علم الاحکام** -------- یہ علم انسانی اعمال و افعال سے بحث کرتا ہے۔ اسلام کے تمام علمی تقاضوں کی تفصیل مہیا کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے اندر عمل کے جواز اور عدم جواز یا صحت اور عدم صحت کی حدود بھی متعین کرتا ہے۔ یہ طلب، اباحت اور وضع پر مبنی شرعی احکام بیان کرتا ہے۔ یہی ”**علم فقہ**“ کا موضوع ہے اور اس کا کام مکلف افراد کی ظاہری زندگی کی اصلاح ہے۔

۳۔ **علم الاخلاص** -------- یہ علم انسانی نفس اور اس کے قلب و باطن کے تزکیہ اور تطہیر سے بحث کرتا ہے۔ انسانی عمل کی باطنی اصلاح حسن نیت اور کمال اخلاص کے طریقے اور ضابطے کی تفصیل مہیا کرتا ہے۔ معروف حدیث جرائیل جو کہ صحیح بخاری کی ”کتاب الایمان“ میں درج ہے کے مطابق ایمان اور اسلام کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ انسانوں کو ”درجہ احسان“ پر فائز کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اسی سے ایمانی معارف اور روحانی لطائف کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہی علم تصوف اور علم طریقت کا موضوع ہے۔ اس کا کام شریعت کے دائرے کے اندر ہر عمل کو اخلاص، للّٰہیت اور روحانی حسن و کمال سے آراستہ کرنا اور انسانی دل و دماغ کو نفسانی رذائل اور مذموم خصائص سے پاک و صاف کرنا ہے۔

اس لیے یہ انتخاب جانا ہو گا کہ طریقت فی الواقع منشائے شریعت ہی کی تکمیل کا نام ہے۔

شریعت کا لفظ چونکہ اسلام کے پورے نظام علم و عمل کو محیط ہے۔ اس لیے طریقت اسی کا ایک اہم رکن ہے۔ طریقت کو شریعت سے اور شریعت کو طریقت سے جدا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بعض ذہنوں میں طریقت اور تصوف کے عنوان اور اصطلاح کے جدید ہونے کے باعث غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عنوان یا اصطلاح تو صرف کسی مضمون اور اس کے مندرجات کی نشاندہی کے لیے ہوتی ہے۔ وہ مقصود بالذات نہیں ہوتی اصل مقصود تو نفس مضمون ہوتا ہے۔ وہ قدیم اور قرآن و سنت پر مبنی ہونا چاہیے۔ کسی اصطلاح کے قدیم یا جدید ہونے سے نفس مضمون کی صحت یا افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قرآن و حدیث سے ماخوذ مروجہ اور متداولہ علوم اور ان کی ہزاروں فنی اصطلاحات جو آج دینی فنون کے طور پر پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔ سب کی سب بعد میں وضع کی گئی ہیں۔ عہد رسالت یا عہد صحابہ میں موجود نہ تھیں۔ لیکن چونکہ نفس مضمون جس کو سمجھنے کے لیے ان اصطلاحات اور فنون کا استعمال ہوتا ہے' فی الحقیقت وہی ہے جو مقصود بالذات ہے۔ یعنی قرآن و سنت۔ اس لیے ان اصطلاحات کی قبولیت' مشروعیت یا افادیت کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ یہی معاملہ طریقت اور تصوف کی باقاعدہ اصطلاحات کا ہے۔ کیونکہ ان کا نفس مضمون بھی قرآن و سنت پر ہی مبنی ہے اور ان کا مقصود و مطلوب بھی قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اس لیے شریعت میں ان کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ کے اندر تعلیمات طریقت کی بھی بنیاد فراہم کر دی گئی ہے۔

طریقت چونکہ نفس انسانی کی اصلاح سے بحث کرتی ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا ہے کہ نفس کی اصلاح طلب خصوصیات کیا ہیں؟ اہل طریقت کے نزدیک نفس انسانی تین بنیادی خصوصیات سے عبارت ہے جن کی اصلاح صوفیانہ عمل اور ریاضت سے کی جاتی ہے۔ وہ خصوصیات درج ذیل ہیں:-

"ہوا و ہوس ---------- غضب ------- اور شہوت"

★ ـــــ ہوا و ہوس کی زیادتی سے نفس انسانی شیطانیت کی صفت اپناتا ہے۔

★ ـــــ غضب کی زیادتی سے نفس انسانی "سبعیت" کی صفت اپناتا ہے۔

★ ـــــ اور شہوت کی زیادتی سے نفس انسانی "بہیمیت" کی صفت اپناتا ہے۔

نفسانی ہوا و ہوس اور حرص و لالچ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر نعمت کی طلب اور خواہش اپنے لیے کرتا ہے اور دوسروں کو کسی نعمت سے بہرہ ور دیکھ کر حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ گویا وہ اپنی ذات کے لیے ہر کمال کا طلبگار ہوتا ہے اور دوسروں کے کمالات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ابلیس بھی اسی صفت حسد کے باعث راندہ درگاہ ہوا۔ بلکہ اسی کی بنیاد پر "شیطان" کے لقب سے معروف ہوا۔ لہٰذا ہوا و ہوس نفسانی انسان کے اندر حسد اور بخل دونوں رذائل کو جنم دیتی ہے۔ اس کا علاج سورہ فاتحہ کی پہلی آیت کے ذریعے کیا گیا ہے۔ جس میں ارشاد ہوتا ہے۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ**۔ جب بندہ باری تعالیٰ کو رب العالمین (تمام مخلوقات کا پروردگار) تصور کرے گا۔ بلکہ ہر نعمت و کمال کا مبداء فیض، مالک اور عطا کنندہ اسی کو سمجھے گا تو پھر کسی کی نعمت یا حسن و خوبی کو دیکھ کر حسد نہ کرے گا۔ کیونکہ اس سے خدا کے فیض عام کی نسبت دل میں اعتراض پیدا ہوگا جس پر کبھی بھی انسان قائم نہیں رہ سکتا۔ خدا کے دیئے ہوئے کو کون چھین سکتا ہے؟ پھر یہ کہ کس کس نعمت اور کمال پر حسد کیا جائے؟ اور کس کس سے جلا جائے؟ کیونکہ تمام موجودات عالم کو اس نے اپنی نوازشات سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ہر ایک کا پالنے والا اور نعمت و کمال سے بہرہ اندوز کرنے والا وہی ہے اور پھر اس کی نعمتوں کا معاملہ بھی بے حساب ہے۔ جس کو نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ شمار کر سکتا ہے۔ لہٰذا حسد اور بخل دونوں رذائل جو ہوا و ہوس نفسانی سے فروغ پاتے ہیں، کا علاج یہی ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ میں باری تعالیٰ کی ربوبیت عامہ اور فیض مطلق کا تصور جاگزیں کرلے اور بجائے کسی کے کمال اور حسن و خوبی پر جلنے کے اس کے خالق و پروردگار کی تعریف کرنے لگے جس نے اسے ان نعمتوں سے نوازا ہے۔ اگر مشاہدے اور سوچ کا انداز یہ ہو جائے جو سورہ فاتحہ کی پہلی آیت میں بیان کیا جارہا ہے تو کبھی بھی حسد اور بخل جیسے

مائم نفس میں فروغ نہ پا سکیں۔ چنانچہ یہ آیت کریمہ اصلاح نفس کے لیے طریقت کی پہلی تعلیمی بنیاد ہے۔

نفسانی غضب کا علاج **الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** سے کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس آیت سے رحمت باری تعالیٰ کا مضمون دل پر وارد ہوتا ہے۔ رحمت ایزدی کا وہ آفاقی اور ہمہ جہت تصور جو **الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** کے دو الفاظ میں مندرج ہے۔ انسانی طبیعت کو غصے اور غیظ و غضب کی کیفیت سے نجات دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان خلوص نیت کے ساتھ اس علاج کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ یہ آیت یہی درس دیتی ہے کہ ذات حق اسے ناراض کرنے والوں کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں کرتی۔ پس رحمت کا یہی مفہوم نفس انسانی کو غضب سے پاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح نفسانی شہوت کا اثر زائل کرنے کے لیے **مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ** سے رہنمائی ملتی ہے۔ یہ الفاظ یوم حساب اور آخرت کے عتاب کی یاد دلاتے ہیں۔ اگر آخرت کے مواخذے اور سزا کا خوف صحیح معنوں میں دل و دماغ پر طاری ہو جائے تو شہوانی خیالات از خود کافور ہو جاتے ہیں۔ ان کا غلبہ حقیقت میں آخرت کے تصور سے غفلت کے باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا سورہ فاتحہ کی تیسری آیت نفس کو اس اثر سے نجات عطا کرنے کا سامان فراہم کرتی ہے۔

پہلی تین آیات میں تین نفسانی خصوصیات کا علاج بیان ہوا تھا۔ اس کے بعد ان خصوصیات کے اثرات و نتائج کے حوالے سے تعلیم دی جا رہی ہے۔

★ ہوا و ہوس نفسانی کا نتیجہ "خود پسندی" ہے۔
★ غضب نفسانی کا نتیجہ "نخوت و تکبر" ہے۔
★ اور شہوت نفسانی کا نتیجہ "اخلاقی بے راہ روی" ہے۔

سورہ فاتحہ نے خود پسندی کا علاج **ایاک نعبد** کے ذریعے فراہم کیا ہے جس میں انسان بارگاہ ایزدی میں اپنی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ حق بندگی ادا کرتا ہے اور اس کے سامنے جبین نیاز زمین پر رکھ

دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر خود پسندی کا بت پاش پاش کرنے کی اور کیا صورت ہو گی کہ بندہ اپنی پیشانی کو اپنے آقا کی بارگاہ میں خاک آلودہ کر رہا ہو اور خود کو عاجز محض تصور کرتے ہوئے زمین پر گرائے ہوئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سجدے اگر اس روح کے ساتھ ہوں اور ان میں اسی تصور کی پختگی پیدا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ خود پسندی کی ساری آرزوئیں ختم نہ ہوں۔

اسی طرح نخوت اور غرور و تکبر کا علاج اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کے الفاظ کی صورت میں مہیا کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے انسان سرتاپا سوالی بن جاتا ہے۔ اپنے حرمان اور کمزوری کا احساس دل میں جاگزیں کیے ہوئے خدا کی بارگاہ میں منگتا بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب انسان کسی کے سامنے دست سوال دراز کر دیتا ہے تو اس کی نخوت و ناموس کے جھوٹے پندار کا بھرم وہیں کھل جاتا ہے۔ اس لیے سورہ فاتحہ نے استعانت کو نخوت و فرعونیت کا علاج قرار دیا ہے۔ جہاں تک شہوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اخلاقی بے راہروی کا تعلق ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہدایت و استقامت کا سامان فراہم کیا جائے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ نے اس گمراہی اور بے راہروی سے نجات دینے کے لیے ہدایت و استقامت کی راہ دکھائی ہے۔ جس پر چل کر باری تعالیٰ کے خصوصی انعامات کا مستحق بنا جاتا ہے اور اس سے انحراف کی صورت میں خدا کے غضب اور عذاب کا سزاوار ہوا جاتا ہے۔

طریقت و تصوف کی ساری تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

۱۔ بندہ اپنے دل میں خدا کی کامل عظمت اور قدرت کا نقش ثبت کرے۔

۲۔ اس کے دل میں اپنی عاجزی اور فروماندگی کا احساس پوری طرح جاگزیں ہو جائے۔

۳۔ وہ ذات حق سے اپنا تعلق عبودیت اس طرح استوار کرے کہ وہ اس کے ماسوا سے بے نیاز ہو جائے۔

۴۔ وہ انعامات ایزدی کے حصول کے لیے ہمہ وقت اس کے مقبول اور انعام یافتہ بندوں کی ظاہری اور باطنی صحبت میں رہے۔

۵- وہ رضائے الٰہی کی خاطر ہر اس تعلق اور ہر اس چیز سے علاقہ منقطع کر لے جو اس کی ناراضگی کا باعث بنتی ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تعلیمات فاتحہ کا ماحصل ہے۔ سورت کا سارا مضمون ان ہی ہدایات کا مجموعہ ہے۔ گویا تعلیمات طریقت کی روح اور اصل حقیقت سورہ فاتحہ کے اندر ضبط کر دی گئی ہے۔ اس لیے یہ سورت انسان کے باطن کی اصلاح کی آئینہ دار بھی ہے۔

باب-۱۸

سورہ فاتحہ
اور
فرائض نبوت کی تکمیل

سورہ فاتحہ اور فرائض نبوت کی تکمیل

قرآن مجید میں چار مقامات پر چہار گانہ فرائض نبوت کا تذکرہ موجود ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ○

(آل عمران، ۳: ۱۶۴)

(وہ رسول ﷺ) جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں فرائض نبوت کی تکمیل کے ضمن میں چار تربیتی ضابطوں کا پتہ چلتا ہے:۔

۱۔ تلاوت آیات ۲۔ تزکیہ نفوس ۳۔ تعلیم کتاب ۴۔ تعلیم حکمت

تلاوت آیات کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو خدا کی ہستی کا یقین ہو جائے اور اس کی ذات و صفات کی معرفت نصیب ہو۔ یہ مقصد تلاوت آیات کے فیضان سے بتمام و کمال پورا ہوتا ہے۔

تزکیہ نفوس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کا قلب و باطن ہر قسم کی محبت و رغبت اور دنیوی الفت کی میل کچیل سے پاک صاف ہو اور صرف خدا کی محبت اور عشق دل میں فروغ پا سکے۔ تزکیہ کا عمل اس تمثیل پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی شخص کسی کیاری سے خود رو پودے جڑ سے اکھاڑ کر اس لیے پھینک دے کہ زمین ان سے پاک ہو کر اپنی ساری قوت تخلیق اسی پودے یا فصل کے اگانے پر صرف کر سکے۔ جو حقیقت میں مطلوب و مقصود ہے۔ اسی طرح انسان کے قلب و باطن کی کیاری میں بھی ہزاروں دنیوی الفتوں اور فانی محبتوں کے پودے از خود اگ آتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں خدا کی محبت کا پودا نشوونما نہیں پا سکتا۔ حضور علیہ الصلوۃ السلام کی نگاہ کرامت اثر کے فیض سے تزکیہ

نفوس کے عمل کا معنی یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں کی زمین کو ہر قسم کی دنیوی محبت و رغبت کے پودوں سے پاک و صاف کر دیا جائے تاکہ نفس انسانی کی ساری قوت تخلیق محبت الہی کے پودے کو فروغ دینے پر صرف ہو سکے۔ لہٰذا فرائض چہار گانہ نبوت میں دوسرا فریضہ یہ تھا کہ لوگوں کے دل کے رشتے دنیا و مافیہا کی محبتوں سے کاٹ کر محبوب حقیقی کی محبت سے جوڑ دیئے جائیں تاکہ دل ہر قسم کی میل کچیل سے پاک ہو کر محبت الہی کے انوار سے منور ہوں۔

تعلیم کتاب کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اپنی اور کائنات کی حقیقت کا علم ہو جائے۔ وہ یقین کے ساتھ یہ جان سکے کہ وہ کون ہے؟ اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ مزید یہ کہ اس کائنات کی اصلیت کیا ہے؟ اور اس سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس میں اس کا کیا مقام ہے؟ بالآخر اس کا اور کائنات کا انجام کب اور کیسے ہو گا؟ علیٰ ہذا القیاس انسان اور کائنات کی اصل حقیقت کی تعلیم کتاب سے ہی ممکن تھی۔ اس لیے اس کو فرائض نبوت میں شامل کر دیا گیا۔

تعلیم حکمت کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو یہ شعور عطا کیا جائے کہ زندگی میں کونسا طرز عمل ایسا ہے۔ جس سے اس کا مقصود حقیقی میسر آئے گا اور کونسا طرز عمل ایسا ہے جس سے وہ ناکام و نامراد ہو گا۔ حقیقت میں یہی دین حق کے چار مقاصد ہیں۔ جن کے حصول کی تعلیم اسلام کا ماحصل ہے کہ انسان کو خدا کی ہستی کا یقین اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہو' اس سے والہانہ محبت کا رشتہ استوار ہو' انسان کو اپنی اور کائنات کی حقیقت کا یقینی علم حاصل ہو اور اسے کائنات ہستی کے اندر زندگی بسر کرنے کے لیے صحیح اور غلط طرز عمل کا شعور میسر آئے تاکہ وہ اس کے مطابق کامیاب زندگی بسر کر سکے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ تربیت کے ذریعے انسانیت کو انہی چار بنیادی حقائق سے آگاہ کیا اور ان کے صحیح شعور کے ذریعے اسے عالمگیر انقلاب سے آشنا کیا۔ ان چاروں فرائض نبوت کا اجمالی تذکرہ سورہ فاتحہ میں بھی درج کر دیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے الفاظ کائنات اور موجودات عالم کے خالق اور

پروردگار کی ہستی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جب کائنات اپنی گوناگوں رنگینیوں کے ساتھ منصۂ عالم پر جلوہ افروز ہے تو یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی خالق اور صانع نہیں ہو گا۔؟ عمارت ہو اور معمار نہ ہو' صنعت ہو اور کاریگر نہ ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کائنات کے اندر نظم و ضبط اور اس کے نظاموں کے اندر خاص ترتیب و ربط تو ہو مگر اسے نہ کوئی وجود میں لانے والا ہو اور نہ کوئی برقرار رکھنے والا ہو۔ یہ تصور عقل انسانی کے لیے قابل قبول نہیں۔ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت خدا کے ہونے اور اس کی ذات و صفات کی معرفت کا درس دیتی ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے فریضہ نبوت کی تکمیل کی راہ ملتی ہے۔ کیونکہ فرائض نبوت اور مقاصد دین میں سب سے پہلا فریضہ اور مقصد و مطلب یہی تھا کہ خدا کی ہستی کا یقین پیدا ہو اور اس کی ذات و صفات کی معرفت کی راہ میسر آئے۔

دوسرا مقصد خدا تعالیٰ سے محبت اور والہانہ عشق پیدا کرنا تھا۔ جس کی تکمیل بھی سورہ فاتحہ کی ابتدائی آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ محبوب کے لیے تین خوبیوں کا حامل ہونا انتہائی ضروری ہے۔ سب سے پہلی خوبی اس کا حسن و جمال ہے کیونکہ محبت کا مرکز و محور بھی محبوب کا حسن و جمال ہی ہوتا ہے۔ محب یہ چاہتا ہے کہ اس کے محبوب سے بڑھ کر کوئی اور صاحب حسن و جمال نہ ہو۔ محبوب کے حسن و جمال اور اس کی رعنائی و دلفریبی کا خیال جس قدر زیادہ ہو گا' محبت اسی قدر شدید سے شدید تر ہوتی جائے گی۔ چنانچہ محب کی آنکھ اپنے محبوب میں سب سے پہلی خوبی ساری دنیا سے بڑھ کر اس کے حسین و جمیل ہونے کی دیکھنا چاہتی ہے۔ دوسری خوبی اس کے لطف و کرم اور شفقت و عنایت کی ہے۔ محبوب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کا دل نہ توڑے۔ اسے ان کی حالت زار پر رحم آئے تو انہیں نظر کرم سے نوازدے اور ہر ایک کو حسب طلب اپنے خرمن جود و سخا سے بہرہ یاب کرے' محبوب اگر سخی' مہربان اور شفیق ہو تو عشاق بھی زیادہ امید وفا رکھتے ہیں:۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

اس طرح اہل دل اور شوق محبت دونوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

تیسری خوبی محبوب کا عادل ہونا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے طلب گاروں میں سے ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھے' ہر ایک سے جذبہ محبت' خلوص اور ایثار و وفا کے ساتھ عدل ہو۔ کوئی یہ تصور نہ کرے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ پھر کھوٹے اور کھرے کی بھی صحیح پہچان ہو تاکہ رسم محبت کی سرعام رسوائی نہ ہو۔ یعنی ہر کسی کو اس کے استحقاق کے ساتھ صلہ نصیب ہو۔ اگر محبوب کے حسن و جمال' انداز دلربائی' لطف و کرم اور عدل و انصاف میں کوئی کمی نہ ہو تو محبت بھی متہائے کمال پر پہنچ سکتی ہے۔ سورہ فاتحہ کی پہلی آیات محبوب حقیقی کی انہی تین خوبیوں کے بیان پر مشتمل ہیں تاکہ اہل دل ہر طرف سے منہ موڑ کر اس انوکھے اور پیارے محبوب و دلربا سے تعلق قائم کریں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے ذریعے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ ہر تعریف اور کلمہ حمد کی مستحق اللہ کی ذات ہے کیونکہ ساری کائنات کے حسن و جمال اسی کے حسن ازلی کے پر تو ہیں۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی حسین و جمیل اور باکمال ہے اور نہ اس صاحب جمال کے ہوتے ہوئے زبان کو کسی اور کے حسن و کمال کی تعریف زیب دیتی ہے۔ لہٰذا انسان اسی محبوب سے کیوں نہ محبت کرے جو سب حسینوں سے بڑھ کر حسین ہے۔

الرحمٰن الرحیم کے ذریعے یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ وہ محبوب لطف و کرم اور شفقت و عنایت میں بھی کوئی حد نہیں رکھتا۔ اس کے خرمن عطا سے بے حساب بھیک ملتی ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں توڑتا۔ اس کے سوا آخر ایسا کونسا محبوب ہو سکتا ہے جس نے کبھی بھی کسی چاہنے والے کا دل شکستہ نہ کیا ہو۔ اس پیر مغاں کی مہربانیوں کا تو یہ عالم ہے کہ جو بھی اس سے خیرات کا طلبگار ہوتا ہے' یہ اسے اس کے مانگنے سے سوا دیتا ہے۔ اس کے میخانے سے کوئی بھی تشنہ کام واپس نہیں لوٹا۔ اس لیے ایسے سخی اور دلنواز

محبوب سے محبت کیوں نہ کی جائے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے ذریعے یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ یہ محبوب عادل اور منصف مزاج ہے۔ اس نے آج تک کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ ہر ایک کی طلب کو جانتا ہے اور اس کی نیت کو پہچانتا ہے۔ اس کے خلوص سے واقف ہے اور اسکے ظاہری وباطنی احوال سے باخبر ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اس کا صحیح صلہ اور جزا دیتا ہے۔ ہر کسی کو اس کے استحقاق کے مطابق جگہ دیتا ہے اور جزا و سزا سے نوازنے میں یہ مالک بھی ہے اور خود مختار و بے نیاز بھی ہے اس لیے عشاق کو کبھی بھی قدر شناسی اور بے توجہی وبے التفاتی کا شکوہ نہیں ہو سکتا۔

گویا سورہ فاتحہ انسانوں کو یہ دعوت دیتی ہے کہ جب عشق ومحبت کے سارے تقاضے، تمام وکمال صرف اسی محبوب کی ذات میں پورے ہوتے ہیں تو تم اسے چھوڑ کر ناقص محبتوں کا دم کیوں بھرتے ہو!

آؤ! ہوس کے تراشیدہ بتوں سے محبت کا کاروبار چھوڑ کر اپنے دل میں صرف رب کائنات کی حقیقی اور دائمی محبت کا پودا لگاؤ اور اس کی خوشبوؤں سے اپنی شخصیت کے آنگنوں کو معطر کرتے رہو۔ یہ دوسرا فریضہ نبوت تھا جس کی تکمیل کا اشارہ اس سورہ مبارکہ میں مہیا کیا گیا ہے۔

تیسرا مقصد انسان اور کائنات کی اصل حقیقت کو آشکار کرنا تھا۔ جس کی وضاحت سورہ فاتحہ کے سارے مضمون میں کئی اعتبارات سے کر دی گئی ہے کہ انسان ہو یا دیگر کائنات' سب خدا کی مخلوق اور اس کی پروردہ موجودات ہیں۔ ان میں سے کوئی شے لائق پرستش اور سزاوار الوہیت نہیں۔ نہ انسان' انسان کی عبادت کے قابل ہے اور نہ دیگر مظاہر قدرت یا اجرام سماوی وارضی۔ وہ تمام وجود جن کی پرستش انسان کسی نہ کسی روپ میں کرتا رہا ہے یا کرتا ہے وہ سب خدا کی بندگی کی شہادت فراہم کر رہے ہیں۔ بلکہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر بھی اس کا بندہ وغلام ہی ہے۔ اس کائنات اور عالم انس وجن سب کا آغاز اللہ تعالیٰ کے چشمہ خالقیت کے فیضان سے ہوا۔ ہر ایک کو بقا

اس کے چشمہ ربوبیت کے فیضان سے ملی اور ہر ایک کو کمال اس کے چشمہ رحمت کے فیضان سے نصیب ہوا۔ بالآخر اس دنیا کے اختتام پر ہر ایک کو پھر اسی کی بارگاہ میں لوٹ جانا ہے۔ جہاں وہ حساب و کتاب اور جزا و سزا کی آخری عدالت بپا کرے گا اور ہر کسی کو اپنے کیے کا انجام بھگتنا ہو گا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان ہو یا جملہ موجودات عالم' سوائے رب ذوالجلال کے کوئی ابدی' قدیم' واجب الوجود اور لازوال نہیں ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ عارضی' حادث' ممکن الوجود اور زوال پذیر ہے۔ اسی حقیقت سے آشنائی تیسرا فریضہ نبوت تھا جو سورہ فاتحہ کی تعلیمات کا اہم رکن بنا دیا گیا ہے۔

چوتھا مقصد انسان کو یہ شعور عطا کرنا تھا کہ کس طرز عمل میں دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے اور کس میں تباہی و بربادی کی تاکہ انسان اپنے مقام و منصب کو پہچانتے ہوئے جادہ صحیح پر گامزن ہو سکے۔ سورہ فاتحہ نے وہ طرز عمل بھی صراحت کے ساتھ بیان کر دیا کہ وہ درج ذیل چار ارکان پر مشتمل ہے۔ عبادت' استعانت' استقامت اور معیت انعام یافتگان۔

حقیقت میں یہی تعلیمات اسلام کا خلاصہ بھی ہیں اور پیغمبرانہ تربیت کا ماحصل بھی۔ انہی تعلیمات کو دنیا میں عملاً متمکن کر دینا فرائض نبوت کی تکمیل تھی جن کی ایک جھلک باری تعالیٰ نے "سورۃ الفاتحہ" کے مضمون میں بھی رکھ دی ہے۔

باب-۱۹

سورہ فاتحہ
اور
تصور وحدت

سورہ فاتحہ اور تصورِ وحدت

سورہ فاتحہ نے ایک ایسی آفاقی حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ جس کا شعور تاریخ انسانی کے ہر دور میں فطرت سلیمہ کی بنیاد پر حاصل رہا اور انبیاء و مرسلین بھی ہمیشہ اسی کی تبلیغ کرتے رہے لیکن کبھی مفادات اور ہوا و ہوس نفسانی کے زیر اثر اور کبھی ہادیان مذاہب کی تعلیمات کے مسخ ہو جانے کے باعث انسان اس حقیقت کے تعین اور معرفت میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ وہ آفاقی حقیقت اس کائنات کے خالق' مالک اور متصرف حقیقی کا صحیح فہم تھا۔ اسی مسئلے پر انسانی طبقات' مختلف مذاہب اور ملل میں تقسیم ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ جب نزول قرآن اور بعثت محمدی ﷺ کا وقت آیا۔ اس وقت فکر انسانی پر چھ مختلف الوہی تصورات چھائے ہوئے تھے۔ "چینی تصور"، "ہندوستانی تصور"، "مجوسی تصور"، "یہودی تصور"، "مسیحی تصور" اور "اہل عرب کا مشرکانہ تصور" (یا مسخ شدہ ابراہیمی تصور)

ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں آفاقی نظام وحدت یا تصور توحید کو مانتا تو تھا لیکن اس کی تعبیر' مفہوم اور تشخص میں اس قدر مغالطے پیدا ہو چکے تھے کہ ہر تصور اپنی جگہ ایک کھلی گمراہی قرار پا چکا تھا۔

چینی تصورِ وحدت

جیسا کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے بیان کیا ہے۔ چین میں زمانہ قدیم سے ہی ایک سب سے بڑی "آسمانی" ہستی کا عقیدہ موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو صفتیں نمایاں طور پر منسوب تھیں۔ ایک اس کی جود و سخا و بخشش کی' دوسری اس کے قہر و غضب اور عقاب و عذاب کی۔ رفتہ رفتہ "آسمان" چینی فکر و نظریہ کا ایک اساسی تصور بن گیا۔ جس کی جھلک ان کے ادب' شاعری اور تمام افکار و نظریات میں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگی۔ رومیوں کو بھی سب سے پہلے چین سے آسمانی مملکت کی خبر ملی۔ لیکن اس تصور

وحدت میں جو چیز شروع سے شریک رہی وہ مقامی خداؤں کا تصور تھا۔ گزرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی پرستش کے لائق تصور ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہر علاقے اور ہر خاندان کے الگ الگ مقامی خدا اور معبود روحیں تھیں۔ لاؤ۔ تزو (Lao-Tzu) اور کنگ فوزی (Kung-Fu-Tse) نے کم و بیش پانچ سو قبل مسیح چین کو معاشرتی حقوق و فرائض کا فلسفہ مہیا کیا اور ایک نئے فکر کا آغاز ہوا لیکن اجداد پرستی اور تصور وحدت کے ملے جلے نظریات بدستور موجود رہے۔

جب یہاں بدھ مذہب کو فروغ ملا تو خود مہاتما بدھ کو خدا کی جگہ دیدی گئی اور اس کی پرستش کا عالمگیر نظام جاری ہو گیا۔ چنانچہ چین، کوریا اور جاپان کی عبادت گاہیں اس نئے معبود کے بتوں سے معمور ہو گئیں۔

علی ہذا القیاس تصور وحدت اور تعدد و اشراک کی دونوں صورتیں ہر دور میں موجود رہیں لیکن توحید کا آفاقی تصور خالص اور واضح انداز میں نکھر کر فروغ نہ پا سکا۔

۲۔ ہندوستانی تصوّرِ وحدت

ہندوستان کے تصور الوہیت کی تاریخ بھی متضاد نظریات سے بھری پڑی ہے۔ ایک طرف وہ فلسفہ تھا جو "اُپنشد" اور "رگ وید" کے نغمات میں "توحید" کے دھندلے تصور کی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور دوسرا وہ عملی مذہب تھا جس نے مظاہر قدرت کی پرستش کے روپ میں تعدد الٰہ کی بدترین صورت اختیار کر لی تھی۔ گویا فکر، بلندیوں کی انتہائی اونچی سطح تک پہنچا مگر عمل پستیوں کی انتہائی نیچی سطح میں مقید رہا۔ ہندوستانی تصور وحدت نے اصنام پرستی کی وہ عملی حالت اپنائی کہ بقول ابو الکلام آزاد "ہر پتھر معبود ہو گیا ہر درخت خدائی کرنے لگا اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی" ہندوستانی تصور الوہیت بیک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اڑا اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا۔ اس کے خواص نے اپنے لئے توحید کی جگہ پسند کی اور عوام کے لئے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی۔ یہاں "رب الارباب" اور "خدائے

"کل" کا تصور بھی تھا جس کی جھلک "اگنی" میں نظر آئی، کبھی "اندر" میں کبھی "ورون" میں کبھی "وایو" میں کبھی "ردر" میں اور کبھی "ماروت" میں اس کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ:-

"وہ ایک ہے جو تمام کائنات کی اصل حقیقت ہے مگر علم والے اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں- وہ ایک نہ تو آسماں ہے نہ زمین ہے' نہ سورج کی روشنی ہے' نہ ہوا کا طوفان ہے' وہ کائنات کی روح ہے' تمام قوتوں کا سرچشمہ' ہمیشگی' لازوالی' وہ کیا ہے؟ وہ شاید رت جو ہر کے روپ میں' ادیتی ہے روحانیت کے بھیس میں' وہ بغیر سانس کے سانس لینے والی ہستی' ہم اسے دیکھ نہیں سکتے' ہم اسے پوری طرح بتا نہیں سکتے' وہی حقیقت یگانہ ہے وہی حق ہے' یہی وحدت ہے جو کائنات کی تمام کثرت کے اندر دیکھی جا سکتی ہے"- (رگ وید)

مذکورہ بالا تعلیمات کے لئے ملاحظہ فرمایئے-

1. THE VEDIC HYMNS-By, Max Muller

2. THE RELIGION OF THE VED-By, Bloom Field

3. THE RIG VED-By, Kaegi

4. LECTURES ON THE RIG VED-By, Ghate

5. THE PHILOSOPHY OF THE UPANISHADS-By, Deussen

6. THE THIRTEEN PRINCIPLES OF UPANISHADS-By,Hume.

اس کے باوجود ہندوستانی تصور وحدت عیسائیت کی طرح "تثلیث" کے چکر سے باہر نہ آسکا- اس میں بھی تریمورتی کا عقیدہ راسخ ہوگیا-

۱- برہم (خالق)

۲- وشنو (رب)

۳ - شو (مالک و قہار)

یہاں خدائے بزرگ و برتر کی ان تینوں صفات کو تین الگ الگ ذاتوں کے لئے ثابت کر دیا گیا۔ اب اس عقیدے کا موازنہ اپنشد کی درج ذیل تعلیم سے پھر کریں۔

"اس کی ذات یگانہ ہے اس ایک کے لئے دوسرا نہیں۔ وہ بے ہمتا ہے' بے مثال ہے' ظرف و زمان اور مکان کی قیود سے بالاتر' ازلی و ابدی' ناممکن الادراک' واجب الوجود' وہی پیدا کرنے والا ہے' وہی حفاظت کرنے والا اور وہی فنا کرنے والا' وہ علۃ العلل اور علت مطلقہ ہے' تمام موجودات اسی سے بنیں' اسی سے قائم رہتی ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ وہ نور ہے' کمال ہے' حسن ہے' سرتاسرپاکی ہے' سب سے زیادہ طاقتور' سب سے زیادہ رحم و محبت والا' سب عبادتوں اور عاشقیوں کا مقصود حقیقی ہے۔"

دوسری طرف "رگ وید' حصہ سوم ص ۹۰۹" پر یہ مرقوم ہے کہ ۳۳۳ (تین سو تینتیس) خدا ہیں۔ اسی تعددی اور اشراکی فلسفے کی توجیہہ "اپنشد" نے یوں کی ہے:۔

"جس طرح رتھ کے پہیے کی تمام شاخیں ایک ہی دائرے کے اندر اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح تمام چیزیں' تمام دیوتا' تمام دنیائیں اور تمام آلات اسی ایک وجود کے اندر ہیں"۔ (برھادریناک باب ۲-۵)

مزید یوں بھی اس حقیقت کو واضح کیا گیا:۔

"یہاں وہ درخت موجود ہے جس کی جڑ اوپر کی طرف چلی گئی ہے اور شاخیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ برھمان ہے لافانی' تمام کائنات اس میں ہے۔ کوئی اس سے باہر نہیں"۔ (تیتریا-۱-۱۰)

اگر مذکورہ بالا تعلیمات کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے کہ وحدت کے کائناتی تصور میں ہندوستانی فلسفے کے مطابق تعدد آلھہ اور شرک کی گنجائش تھی۔ گویا خدا کو اتنی بڑی ہستی تصور کر لیا گیا تھا کہ باقی کروڑوں دیوی دیوتاؤں

کو اسی کا جزو یا اس کی مختلف شاخوں کا مظہر تصور کر لیا گیا۔ اس لیے یہاں بھی وحدت کا تصور فکر اور نظریئے کی حد تک کبھی "اپنشدوں" میں، کبھی "پرانوں" میں، کبھی "ویدانت" میں، کبھی "یوگ" میں اور کبھی "گیتا" کے رنگین اور محبت آمیز نغمات میں، الغرض مختلف مقامات پر موجود رہا۔ لیکن انسانی عمل مستقل طور پر شرک کی آلائشوں میں گرفتار رہا۔ لہٰذا ہندوستانی مذہب میں تصور وحدت نکھر کر اس طرح کبھی منظر عام پر نہ آیا کہ اس نے شرک و تعدد کی تمام صورتوں کی نفی کر دی ہو اور زندگی موثر طور پر ایک نظام وحدت میں منسلک ہو گئی ہو۔

۳۔ مجوسی تصورِ وحدت

زرتشت کے ظہور سے قبل قدیم ایران میں ہندوستانی دیوتاؤں کی مانند پرستش کا نظام جاری تھا۔ اس وقت بھی دیوتائی طاقتوں کو ان کے دو بڑے مظہروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک طاقت روشن ہستیوں کی تھی جو انسان کو خوشی و مسرت کی دولت بخشتی تھی۔ دوسری تاریک عفریتوں کی تھی جو تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کا سرچشمہ تصور ہوتی تھی۔ زرتشت کے ظہور سے خدائے واحد "اھورامزدا" کی پرستش کا آغاز ہوا اور تصور وحدت کی تبلیغ ہوئی۔ لیکن چند صدیوں کے بعد ایران کے قدیم تصورات اور ہندوستانی عقائد کے اثرات پھر غالب آگئے اور ساسانی عہد میں عقائد و نظریات کی تدوین نو ہوئی تو قدیم "مجوسی" (یہ مذہب ظہور زرتشت سے پہلے آتش پرستی پر مبنی تھا)۔ آگ کے پجاریوں کو "موگوش" کہتے تھے۔ بعد ازاں اسی کو عربوں نے "مجوس" کے نام سے بدل دیا۔ "یونانی" اور "زرتشتی" عقائد کا ملغوبہ تیار ہو گیا۔ اس کا تشخص کم و بیش سارا مجوسی تصور سے ہی قائم ہوا۔ اس کی بنیاد "ثنویت" (Dualism) کے عقیدے پر تھی۔ خیر و شر کی دو الگ الگ قوتیں تسلیم کی جاتی تھیں۔ اھورامزدا (یزداں) خیر اور نیکی کا خدا تصور ہونے لگا اور "اھرمن" شر اور بدی کا۔ عبادت کی بنیاد سورج اور آگ کی پرستش پر رکھی گئی۔ اس طرح تصور وحدت یہاں بھی دھندلا گیا۔

۴- یہودی تصور وحدت

یہاں بھی تصورِ وحدت "ابنیت" کی صورت میں مسخ ہو گیا۔ یہودیوں سے تعلیمات موسیٰ علیہ السلام کے مسخ ہو جانے کے بعد بھی خدائے بزرگ و برتر کو ایک تو مانا لیکن اس کے ساتھ حضرت عزیر علیہ السلام کو اس کا بیٹا تسلیم کر لیا۔ یہ ابوت تصورِ وحدت کے منافی تھی۔ مزید برآں ان کے ہاں خدا کی ذات کی نسبت تجسم کا تصور بھی پایا جانے لگا۔ تورات اور دیگر مسخ شدہ صحائف میں خدا کا بار بار متشکل ہو کر نمودار ہونا اور مخاطبات الٰہیہ کا تمام تر انسانی اوصاف و جذبات سے آلودہ ہونا کئی مقامات پر نظر آتا ہے۔

۵- مسیحی تصورِ وحدت

بقول مولانا ابوالکلام آزاد تجسم اور تنزیہ کے لحاظ سے مسیحی تصور کی سطح اعلاوہی تھی جہاں تک یہودی تصور پہنچ چکا تھا۔ مگر تعلیمات عیسیٰ علیہ السلام کے مسخ ہونے کے بعد جب مسیحی تصورات کا رومی اصنام پرستی کے عقائد سے امتزاج ہوا تو "اقانیم ثلاثہ" اور "مسیح پرستی" کے تصورات غالب آ گئے۔ اب مسیحیت کو دوسرے مشرکین کی بت پرستی پر تو انکار و اختلاف تھا لیکن اپنی بت پرستی اور شرک کی آمیزش پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت مریم علیہا السلام، تینوں کے اتحاد سے ان کا تصورِ الوہیت مکمل ہوتا تھا اور ہر ایک کی پرستش عین حق و ثواب تصور ہونے لگی تھی۔ نزولِ قرآن کے وقت مسیحیت اسی صورت حال سے دوچار تھی۔

۶- مشرکین عرب کا تصورِ وحدت

سرزمین عرب میں ملت ابراہیمی کی تعلیمات بھی مسخ ہو کر کفر و شرک کا روپ دھار چکی تھیں۔ یہاں بھی خدائے واحد اور رب کائنات کا تصور موجود تھا۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں مشرکین مکہ کے حوالے سے کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

اور اگر آپ ان مشرکین سے پوچھیں کس نے بنائے آسمان اور زمین' اور (کس نے) کام میں لگائے سورج اور چاند تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ (العنکبوت '۲۹:۶۱)

اس سے آگے پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کس نے اتارا آسمان سے پانی پھر اس کے سبب سے زمین کو مردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کر دیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ (العنکبوت '۲۹:۶۳)

ان آیات سے اتنی بات سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے کہ عرب کے دور جاہلیت میں بھی وحدت کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ایسے مشرکانہ عقائد مل گئے تھے جنہوں نے اس میں تعدد آلہ کی راہیں وضع کر لی تھیں۔ کئی بت پرستش کے لائق سمجھے جاتے تھے۔ مختلف امور کی انجام دہی کے لیے الگ دیوتا تھا۔ ان میں بھی چھوٹے بڑے کا امتیاز تھا۔ لات' منات' عزیٰ' ہبل وغیرہ یہ ایسے بت تھے جن کی کھلی پرستش ہوتی' ان کے نام پر جانور ذبح کیے جاتے۔ بوقت ذبح بجائے تکبیر کے ان کے نام پکارے جاتے' ان کی رضا و خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتیں۔ اور ان سب مشرکانہ اعمال کا جواز یوں فراہم کیا جاتا:۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

ہم ان بتوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں (اس طرح) اللہ کے زیادہ قریب کر دیں (الزمر '۳۹:۳)

بارگاہ ایزدی میں حصول قرب کے لئے توسّل کے تصور کو انہوں نے کفر و شرک سے بدل دیا تھا۔ اسی طرح نماز' حج' قربانی اور دیگر اسلامی مناسک و تصورات کو انہوں نے مخصوص عقائد اور خیالات کے ذریعے مسخ کر دیا تھا اور ہر معاملے میں شرک

کی آمیزش ہو چکی تھی چنانچہ تصور وحدت اپنی اصل صورت میں یہاں بھی باقی نہ تھا۔

اسلام نے دنیا کے تمام باطل تصورات اور مسخ شدہ حقائق کو رد کرتے ہوئے تصور وحدت کو اس کی صحیح نکھری ہوئی کامل صورت میں پیش کیا اس نے بانی اسلام ﷺ کی تعظیم و احترام، اس کے بے انتہا کمالات و معجزات اور شرف و عظمت کی لاتعداد و غیر متصور بلندیوں کے باوجود کسی صورت میں اس کی عبادت کی راہ نہیں کھولی جیسا کہ دوسرے مذاہب نے ہمیشہ کیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ اعلان جو انہوں نے حضور علیہ السلام کی وفات پر بر سر منبر کیا تھا۔ اس حقیقت کا شاہد عادل ہے۔

من کان منکم یعبد محمدا فان محمدا قد مات و من کان منکم یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت

(صحیح البخاری، ۱: ۵۱۷)

تم میں سے اگر کوئی حضرت محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا، سو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں (اور وفات پانے والے کی عبادت نہیں ہو سکتی) اور اگر تم میں سے کوئی اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اور اس کے لئے کبھی موت نہیں۔

اس اعلان نے اسلام کے اندر شرک کے ان تمام توہمات و خیالات کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا جو کبھی بھی کسی باطل خیال آرائی سے پیدا ہو سکتے تھے۔ سورہ فاتحہ نے اسی تصور وحدت کو بڑے واضح اور دو ٹوک انداز میں بیان کیا ہے جو ہمیشہ کے لئے انسانیت کو رہنمائی عطا کر رہا ہے۔ سورہ فاتحہ کو سمجھ لینے کے بعد تصور وحدت دل و دماغ میں اس قدر جاگزیں ہو جاتا ہے کہ شرک و تعدد کی گرد و غبار بھی انسانی فکر کو چھو نہیں سکتی۔ اس کا اسلوب بیان اس مضمون کے ضمن میں یہ ہے کہ۔

۱۔ ساری کائنات اور اس کے جملہ موجودات کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔

☆ تمام مخلوقات کو پالنے اور کمال تک پہنچانے والا "رب" صرف وہی ہے۔

☆ دنیا و آخرت میں ہر کسی پر مہربانی اور لطف و کرم کرنیوالا "رحمٰن و رحیم" صرف وہی ہے۔

☆ ہر کسی کو جواب طلبی اور مواخذے کے بعد جزا و سزا سے ہمکنار کرنے والا "مالک" صرف وہی ہے۔

☆ ہر کسی کی عبادت اور پرستش کا سزاوار "معبود" صرف وہی ہے۔

☆ ہر محتاج اور ضرورتمند کی مدد اور کفالت کرنے والا "مستعان" صرف وہی ہے۔

☆ ہر گمراہ اور طالب ہدایت کو راہ راست پر لانے والا "ہادی" صرف وہی ہے۔

☆ ہر نیکوکار اور حق کے پیرو کو نعمتوں سے نوازنے والا "منعم" صرف وہی ہے۔

☆ ہر غلط کار اور باطل کے پیرو کو غضب و ضلالت کے انجام سے روشناس کرنے والا بھی صرف وہی ہے۔

الغرض کائنات کی ابتداء سے انتہا تک متصرف حقیقی ایک ہی ہستی ہے اور صرف اسی کے سامنے جبین عبادت جھکانے کی اجازت دی گئی ہے۔ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت سے لے کر آخری آیت تک اگر غور سے دیکھیں تو کوئی مقام خدائے واحد کے ذکر سے خالی نہیں اور نہ اس کی وحدت کے بیان پر کوئی التباس یا دھندلا پن دکھائی دیتا ہے۔ اس میں باری تعالیٰ کے کسی ایسے اوتار، مظہر یا نمائندے کا ذکر نہیں جس کی عبادت اصالۃً یا نیابتاً روا رکھی گئی ہو۔ نہ سورہ فاتحہ کسی دیوتا کا تصور دیتی ہے اور نہ کسی ثنویت و تثلیث کا، یہ اول سے آخر تک پیغام توحید ہے اور توحید کا بھی ایسا واضح اعلان ہے کہ جس میں نہ "شرک فی الذات" کی گنجائش ہے نہ "شرک فی الصفات" کی۔ تصور وحدت کے جو اساسی نظریات سورہ فاتحہ نے مہیا کر دیئے ہیں پورے قرآن میں کہیں بھی ان سے متضاد و متناقض نقطہ نظر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس میں یہ گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ خواص تصور وحدت کو زیب نظر بنائیں اور عوام مشرکانہ معتقدات کو۔ عوام و خواص سب کے لئے توحید کا ایک ہی تقاضا ہے کہ خدا کی ذات و صفات میں کسی کو

بالواسطہ یا بلاواسطہ جزواً یا کلیتاً دائمی یا عارضی طور پر الغرض کسی حال اور کسی رنگ میں بھی شریک نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ سورہ فاتحہ کی اجمالی دعوت تھی۔ جس کی تفصیل پورا قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولقد آتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم

اور بیشک ہم نے آپ کو بار بار دہرائی جانے
والی سات آیات اور قرآن عظیم عطا کر دیا۔

اشاریه

القرآن

نمبر شمار	اطراف الآیات	حواله	صفحه
	الفاتحه: ١		
١	الحمد لله رب العالمینO	١: ١	١٤٢، ٢٢١
٢	مالك یوم الدینO	١: ٣	١٨١
٣	ایاك نعبد وایاك نستعینO	١: ٤	١١٩، ١٤٤، ١٨٥
٤	اهدنا الصراط المستقیمO	١: ٥	١٢٥، ١٤٧، ١٥٨، ١٩٧
٥	صراط الذین انعمت علیهم ...	١: ٦-٧	٢٥، ١٢٩، ١٥٠، ١٥٨، ١٩٨، ١٩٩، ٢١٧، ٢٧٠
٦	غیرالمغضوب علیهم ولاالضالینO	١: ٧	١٥١، ١٨١، ٢٠١، ٢١٧
	البقره: ٢		
٧	یایها الناس اعبدوا ربکم الذی ...	٢: ٢١-٢٢	١٠٢
٨	فاما یأتینکم منی هدی ...	٢: ٣٨	٣٧
٩	قالوا اتحدثونهم بما فتح الله علیکم ...	٢: ٧٦	١٩
١٠	وکانوا من قبل یستفتحون ...	٢: ٨٩	٢٢
١١	ماتعبدون من بعدی ...	٢: ١٣٣	١١٠
١٢	وقالوا نعبد الهك واله ابائك ...	٢: ١٣٣	١١١
١٣	وقالوا کونوا هودا اونصاری ...	٢: ١٣٥	١٠٩

نمبر شمار	اطراف الآیۃ	حوالہ	صفحہ
۱۴	حنیفا وماکان من المشرکینO	۲: ۱۳۵	۱۱۰
۱۵	امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس–	۲: ۱۴۳	۲۶۵
۱۶	استعینوا بالصبر والصلوة–	۲: ۱۵۳	۱۹۶
۱۷	ولکن البر من امن با لله ...	۲: ۱۷۷	۲۲۷
۱۸	والصابرین فی البأسآء والضرآء ...	۲: ۱۷۷	۱۲۲
۱۹	یایها الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافة–	۲: ۲۰۸	۲۷۲
۲۰	ثم توفی کل نفس ماکسبت ...	۲: ۲۸۱	۲۵۴
	آل عمران: ۳		
۲۱	وما من إله الا الله ...	۳: ۲	۱۶۲
۲۲	ذلك من انباء الغیب نوحیه إلیك–	۳: ۴۴	۹۱
۲۳	واذ اخذ الله میثاق النبیین ...	۳: ۸۱	۸۳
۲۴	ان اول بیت وضع للناس ...	۳: ۹۶	۳۰
۲۵	وجنة عرضها السموات والارض...	۳: ۱۳۳	۱۲۲
۲۶	والکاظمین الغیظ والعافین عن ...	۳: ۱۳۴	۲۴۹
۲۷	هذابیان للناس وهدی وموعظة ...	۳: ۱۳۸	۱۳۵
۲۸	لاتهنوا ولاتحزنوا وانتم الاعلون ...	۳: ۱۳۹	۱۴۹، ۲۷۲
۲۹	لقد من الله علی المؤمنین اذ ...	۳: ۱۶۴	۲۱۵
۳۰	یتلوا علیهم آیاته ...	۳: ۱۶۳	۲۸۵
۳۱	وما کان الله لیطلعکم علی الغیب ...	۳: ۱۷۹	۲۱

نمبر شمار	اطراف الآيات	حواله	صفحه
۳۲	ويتفكرون في خلق السموات ...	۳: ۱۹۱	۱۳۶
	النساء: ٤		
۳۳	رب السموات والارض وما ...	٤: ۳۷	۱٦۳
۳٤	ان الله لايظلم مثقال ذرة -	٤: ٤۰	۲۵٤
۳۵	واذا قيل لهم تعالوا الى ما انزل ...	٤: ٦۱	۱۰۷
۳٦	لولا فضل الله عليكم ورحمته ...	٤: ۸۳	۱۰٤
۳۷	من يشاقق الرسول من بعد ماتبين ...	٤: ۱۱۵	۱۷۵
۳۸	ان يكن غنيا او فقيرا ...	٤: ۱۳۵	۲۵٦
۳۹	ومن يكفر با لله وملئكته ...	٤: ۱۳٦	۲۲۷
	المائدة: ۵		
٤۰	جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما -	۵: ۹۷	۳۰
٤۱	يايها الناس قدجاءكم برهان ...	۵: ۱۷٤	۳۳
	الانعام: ٦		
٤۲	فتحنا عليهم ابواب كل شيء حتى اذا فرحوا-	٦: ٤٤	۱۸
٤۳	وعنده مفاتيح الغيب لايعلمها الاهو-	٦: ۵۹	۲۰
٤٤	ولارطب ولايابس الا في كتاب مبينO	٦: ۵۹	۳۵
٤۵	وما قدروا الله حق قدره ...	٦: ۹۲	۱۰٦
٤٦	ان هذا صراطى مستقيمافاتبعوه-	٦: ۱۵۳	۱۹۸

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
٤٧	قل أغير الله ابغى ربا ...	٦: ١٦٤	١٦٢
	الاعراف: ٧		
٤٨	لاقعدن لهم صراطك المستقيم–	٧: ١٦	١٢٦
٤٩	كلوا واشربوا ولاتسرفوا–	٧: ٣١	٢٦٦
٥٠	ربنا افتح بيننا وبين قومنا بالحق ...	٧: ٨٩	٢٤
٥١	ولو ان اهل القرى امنوا ...	٧: ٩٦	١٨
٥٢	واتبعوه لعلكم تهتدون –	٧: ١٥٨	١١٣، ١٩٩
٥٣	ألست بربكم قالوا بلى ...	٧: ١٧٢	٢٦
	الانفال: ٨		
٥٤	يريد الله ان يحق الحق بكلماته –	٨:٨	٢٤
٥٥	يٰايها الذين امنوا استجيبوا الله ...	٨: ٢٤	٣٢
٥٦	ما كان الله ليعذبهم وانت فيهم –	٨: ٣٣	٢١٤
	التوبه : ٩		
٥٧	لمسجد اسس على التقوى –	٩: ١٠٨	٣٦
	يونس : ١٠		
٥٨	ان الله لايظلم الناس شيا ...	١٠: ٤٤	٢٥٤
	هود: ١١		
٥٩	تلك من انباء الغيب نوحيها إليك ...	١١: ٤٩	٩١

نمبرشمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
	یوسف: ۱۲		
٦٠	فصبر جمیل واللہ المستعان علی ماتصفون○	۱۲: ۱۸	۱٦٥
٦۱	وتفصیل کل شیئ-	۱۲: ۱۱۱	۳٥
	الرعد: ۱۳		
٦۲	قل اللہ خالق کل شیئ وهو الواحد القهار-	۱۳: ۱٦	۱٦٦
٦۳	والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم ...	۱۳: ۲۲	۲٤۹
	ابراهیم: ۱٤		
٦٤	الر کتاب انزلناه ...	۱٤: ۱-۲	۱۳٥
	الحجر: ۱٥		
٦٥	لاغوینهم اجمعین ...	۱٥: ۳۹	۱۲۹
٦٦	ولقد اتیناك سبعا من المثانی ...	۱٥: ۸۷	۳٤، ٥۲
	النحل: ۱٦		
٦۷	کذلك یتم نعمته علیکم -	۱٦: ۸۱	۱٦٦
٦۸	ونزلنا علیك الکتاب ...	۱٦: ۸۹	۳٤
	الاسراء: ۱۷		
٦۹	ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم-	۱۷: ۹	۱۳٥، ۲۰۱
۷۰	ولا تجعل یدك مغلولة ...	۱۷: ۲۹	۲٦۷

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
٧١	ان من شیی الایسبح بحمده-	١٧ : ٤٤	١٦١
	الکهف: ١٨		
٧٢	من یهدی الله فهو ...	١٨ : ٧١	١٦٧
٧٣	فوجدا عبدا من عبادنا ...	١٨ : ٦٥	١٨٣
	مریم : ١٩		
٧٤	فاولئك مع الذین انعم الله ...	١٩ : ٥٨	٢٢٨
٧٥	ان كل من فی السموات ...	١٩ : ٩٣	١٧٣
	طه: ٢٠		
٧٦	وهل اتاك حدیث موسی ...	٢٠ : ٩ - ١٤	٩٢، ١٦٤
٧٧	لعلی اتیكم منهابقبس واحد علی النار ...	٢٠ : ١٠	٩٤
٧٨	اننی انا الله لا اله الا انا ...	٢٠ : ١٤	
٧٩	اذهب الی فرعون ...	٢٠ : ٢٤-٣٢	٩٣
	الأنبیاء : ٢١		
٨٠	وما ارسلناك الا رحمة للعالمین()	٢١ : ١٠٧	١٠٤
٨١	قال رب احكم بالحق ...	٢١ : ١١٢	١٦٥
	الحج: ٢٢		
٨٢	الملك یومئذ لله یحكم بینهم-	٢٢ : ٥٦	١٦٤

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
	المومنون: ۲۳		
۸۳	أفحسبتم انما خلقناكم عبثا ...	۲۳: ۱۱۰-۱۱۶	۱۱۳، ۱۶۴
۸۴	فتعال الله الملك الحق ...	۲۳: ۱۱۶	۱۶۴
	الفرقان: ۲۵		
۸۵	والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ...	۲۵: ۶۷	۲۶۶
	الشعراء: ۲۶		
۸۶	وان ربك لهو العزيز الرحيم○	۲۶: ۹	۱۶۳
	العنكبوت: ۲۹		
۸۷	والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا	۲۹: ۴۹	۱۶۷
۸۸	ولئن سألتهم من خلق السموات ...	۲۹: ۶۱	۲۹۹
۸۹	ولئن سألتهم من نزل من السماء ...	۲۹: ۶۳	۲۹۹
	الروم: ۳۰		
۹۰	كان حقا علينا نصر المؤمنين○	۳۰: ۴۷	۱۹۴
	لقمان: ۳۱		
۹۱	واقصد في مشيك واغضض من ...	۳۱: ۱۹	۲۶۶
	السجده: ۳۲		
۹۲	ثم سواه ونفخ فيه من روحه ...	۳۲: ۹	۲۴۸

نمبر شمار	اطراف الآیات	حواله	صفحه
١٠٤	انك لتهدى إلى صراط مستقيم –	٤٢: ٥٢	١٤٣، ١٩٨
	الدخان: ٤٤		
١٠٥	وما خلقنا السموات والارض ...	٤٤: ٣٨-٣٩	١٣٦
	الفتح: ٤٨		
١٠٦	انا فتحنالك فتحا مبينا–	٤٨: ١	٢٢
١٠٧	وغضب الله عليهم ولعنهم ...	٤٨: ٦	١٦٦
١٠٨	فانزلنا السكينة عليهم ...	٤٨: ١٨	٢٢
١٠٩	اشداء على الكفار رحماء بينهم –	٤٨: ٢٩	١٥١
	النجم: ٥٣		
١١٠	ان الظن لايغنى من الحق شيا–	٥٣: ٢٨	١٩٨
	التغابن: ٦٤		
١١١	له الملك وله الحمد وهو على ...	٦٤: ١	١٦١
	الملك: ٦٧		
١١٢	الذى خلق الموت والحياة ...	٦٧: ٢	١٣٧
	الجن: ٧٢		
١١٣	عالم الغيب فلايظهر على غيبه ...	٧٢: ٢٦-٢٧	٢١

نمبر شمار	اطراف الآيات	حواله	صفحه
	المدثر : ۷۴		
۱۱۴	يايها المدثر○ قم فانذر○	۷۴: ۱-۲	۸۹
	القيامة: ۷۵		
۱۱۵	أيحسب الانسان ان يترك سدى ...	۷۵: ۳۶-۴۰	۱۱۴
	النازعات: ۷۹		
۱۱۶	اذهب الى فرعون انه طغى○	۷۹: ۱۷	۹۳
	التكوير: ۸۱		
۱۱۷	واليل اذا عسعس والصبح ...	۸۱: ۱۷-۱۹	۶۷، ۶۸
	الفجر: ۸۹		
۱۱۸	يايتها النفس المطمئنة ...	۸۹: ۲۷-۳۰	۲۰۴
	الضحى: ۹۳		
۱۱۹	ووجدك ضالا فهدى○	۹۳: ۷	۵۷
	الانشراح: ۹۴		
۱۲۰	ان مع العسر يسرا○	۹۴: ۶	۱۹۶
	التين: ۹۵		
۱۲۱	لقد خلقنا الانسان في احسن تقويم○	۹۵: ۵	۱۷۱

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
	العلق: ٩٦		
١٢٢	إقراء باسم ربك الذى خلقO ...	٩٦: ١	٨٨
	العصر : ١٠٣		
١٢٣	والعصرO ان الانسان لفى خسرO	١٠٣: ١-٣	١٤٨
	النصر : ١١٠		
١٢٤	اذا جاء نصر الله والفتحO	١١٠: ١-٣	١٦
	الاخلاص: ١١٢		
١٢٥	قل هو الله احدO الله الصمد ...	١١٢: ١-٤	١٠٨

الأحاديث والآثار

نمبر شمار	اطراف الاحادیث والآثار	صفحه
۱	کل امر ذی بال لم یبداء ۰۰۰	۱۰۷
۲	لاصلوة لمن لم یقراء بفاتحة الکتاب–	۲۸
۳	لاصلوة لمن لم یقراء بام القرآن –	۲۹
۴	والذی نفسی بیده ما انزل الله فی التوراة ۰۰۰	۳۲
۵	ا بشر بنورین قد اوتیتهما لم یوتها نبی ۰۰۰	۳۳
۶	اوتیت بجوامع الکلم –	۳۵
۷	وهی ام القرآن وهی ام الکتاب ۰۰۰	۳۶
۸	قسمت الصلوة بینی وبین عبدی نصفین ۰۰۰	۴۱
۹	ام القرآن عوض عن غیرها ولیس غیرها عوضا عنها–	۴۲
۱۰	فاتحة الکتاب تعدل ثلثی القرآن –	۴۲
۱۱	اعظم سورة فی القرآن الحمد لله رب العالمین–	۴۲
۱۲	افضل القرآن الحمد لله رب العالمین–	۴۳
۱۳	ان القوم لیبعث الله علیهم العذاب حتما ۰۰۰	۴۳
۱۴	فاتحة الکتاب شفاء من کل داء–	۴۴
۱۵	الااخبرک باخیر سورة نزلت فی القرآن ۰۰۰	۴۴
۱۶	فاتحة الکتاب شفاء من کل شیئ الا السام–	۴۵
۱۷	فاتحة الکتاب شفاء من السم –	۴۵
۱۸	ما کان یدریه انها رقیة –	۴۶
۱۹	اذا وضعت جنبک علی الفراش وقرأت فاتحة ۰۰۰	۴۷

Website: http://www.allofficetool.com

اقوال

اشعار

نمبر شمار	اشعار	شاعر	صفحہ
۱	گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن	اقبالؒ	۱۲ ۳۱
۲	فان من جودك الدنيا وضرتها ومن علومك علم اللوح والقلم	امام بوصیری	۳۵
۳	عدم یزداں سے اتنا بے تکلف بڑا دربار ہے' آہستہ بولو	عدم	۴۰
۴	رموزِ سرِّ دل بے دل چہ داند		۴۲
۵	مصطفیٰ اندر حراء خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید	اقبالؒ	۸۷
۶	دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے	اقبالؒ	۹۲
۷	حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید وز رسالت در تنِ ما جاں دمید	اقبالؒ	۱۱۲

نمبر شمار	اشعار	شاعر	صفحہ
۸	پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن ترا نہ من	اقبالؒ	۱۲۱
۹	ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم وذکا جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا	بہادر شاہ ظفر	۱۲۱
۱۰	متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی	اقبالؒ	۱۸۲
۱۱	تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی مری دنیا فغانِ صبح گاہی	اقبالؒ	۱۸۲
۱۲	عبد دیگر عبدہ چیزے دگر ایں سراپا انتظار او منتظر	اقبالؒ	۱۸۳
۱۳	شہود کیسے ہو حاصل اسے زمانے میں وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد	اقبالؒ	۱۸۶
۱۴	ولا بحلقہ رندانِ بزمِ عشق درآ کہ جرعہ ز شرابِ بقا دہند ترا	خواجہ اجمیریؒ	۱۸۶
۱۵	عقل قرباں کن بہ پیشِ مصطفیٰ		۱۹۷

نمبر شمار	اشعار	شاعر	صفحہ
۱۶	گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے	اقبالؒ	۱۹۸
۱۷	عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ	اقبالؒ	۱۹۸
۱۸	گردِ مستاں گرد، گر ے کم رسد بوئے رسد بوئے او گر کم رسد، رؤیتِ ایشاں بس است		۲۱۴
۱۹	شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ	شیخ سعدیؒ	۲۵۰
۲۰	فدائے شیوہ رحمت کہ در لباسِ بہار بعذر خواہی رندان بادہ نوش آمد		۲۵۲
۲۱	گدایاں را ازیں معنی خبر نیست کہ سلطان جہاں با ماست امروز		۲۵۲
۲۲	نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو کہ مستحق کرامت گناہ گارانند		۲۵۳

نمبر شمار	اشعار	شاعر	صفحہ
۲۳	آسائش دوگیتی تفسیرِ ایں دو حرف است بادوستاں تلطف بادشمناں مدارا		۲۵۳
۲۴	ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن	اقبالؒ	۲۵۷
۲۵	ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں	ساحر لدھیانوی	۲۶۰
۲۶	مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر	اقبالؒ	۲۶۰
۲۷	ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں	اقبالؒ	۲۶۲
۲۸	یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا	اقبالؒ	۲۷۲
۲۹	ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق		۲۸۸

اعلام

اماکن وبلاد

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف / مؤلف	مطبع / سن اشاعت
۱	القرآن الکریم	منزل من اللہ	
۲	صحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ ۲۵۶ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی ۱۳۷۵ھ
۳	صحیح المسلم	امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ ۲۶۱ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی ۱۳۷۵ھ
۴	جامع الترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ۲۷۹ھ	فاروقی کتب خانہ ملتان
۵	سنن النسائی	امام احمد بن اشعث نسائیؒ ۳۰۳ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی
۶	سنن ابی داؤد	ابو داؤد سلیمان بن اشعثؒ ۲۷۵ھ	مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۳۱۶ھ
۷	سنن ابن ماجہ	امام محمد بن یزید القزوینیؒ ۲۷۳ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی
۸	السنن الکبریٰ	امام احمد بن یزید القزوینیؒ ۲۷۳ھ	مکتبہ نشر السنہ ملتان
۹	مستدرک حاکم	امام ابو عبد اللہ محمد الحاکمؒ ۴۰۵ھ	دار الباز مکہ مکرمہ
۱۰	مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ ۲۴۱ھ	دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
۱۱	العرف الشذی	علامہ محمد انور کشمیریؒ ۱۳۵۲ھ	المکتبہ الرحیمیہ دیوبند (بھارت)
۱۲	مصنف عبد الرزاق	امام عبد الرزاق بن ہمامؒ ۲۱۱ھ	مکتب اسلامی بیروت ۱۹۷۰ء
۱۳	مرقات المفاتیح	ملا علی بن سلطان قاریؒ ۱۰۱۴ھ	مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۳۹۰ھ
۱۴	لمعات التنقیح	شیخ عبد الحق دہلویؒ ۱۰۵۲ھ	المکتبہ المعارف دہلی (بھارت)
۱۵	المعجم الاوسط	حافظ ابو القاسم طبرانیؒ ۳۶۰ھ	مکتبہ المعارف ریاض ۱۹۸۷ء
۱۶	شعب الایمان	ابو بکر احمد بن حسین البیہقیؒ ۴۵۸ھ	
۱۷	تہذیب التہذیب	امام ابن حجر عسقلانیؒ ۸۵۲ھ	مطبع حیدری حیدر آباد
۱۸	الحدیقہ الندیہ	علامہ عبد الغنی نابلسیؒ [illegible]	مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد ۱۹۷۷ء
۱۹	المواہب اللدنیہ	علامہ احمد بن محمد [illegible] ۹۱۱ھ	دار المعرفہ بیروت ۱۹۷۳ء
۲۰	مطالع المسرات	محمد مہدی بن احمد الفاسیؒ	مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد
۲۱	الصارم المسلول	امام ابن تیمیہؒ ۷۲۸ھ	مکتبہ نشر السنہ ملتان
۲۲	نشر الطیب	مولانا اشرف علی تھانوی ۱۳۶۲ھ	تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی

نمبر شمار	کتاب	مصنف / متوفی	مطبع / سن اشاعت
۲۳	تفسیر کبیر	امام فخرالدین رازیؒ، ۶۰۶ھ	دار الفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ
۲۴	تفسیر بیضاوی	قاضی ناصر الدین البیضاویؒ	دار صادر بیروت
۲۵	تفسیر کشاف	امام محمود بن عمر زمخشریؒ، ۵۲۸ھ	مطبعہ الاستقامہ قاہرہ، ۱۹۵۳ء
۲۶	تفسیر روح المعانی	امام شہاب الدین آلوسیؒ، ۱۲۷۰ھ	مکتبہ امدادیہ ملتان
۲۷	الاتقان	امام جلال الدین سیوطیؒ، ۹۱۱ھ	مطبعہ حجازی قاہرہ
۲۸	اسباب النزول	امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدیؒ	دار المعرفہ بیروت
۲۹	المفردات	امام راغب اصفہانیؒ، ۵۰۲ھ	نور محمد کتب خانہ کراچی
۳۰	جواہر البحار	عبد الحی بن شرف الدین نوویؒ ۹۷۳ھ	مطبع مصطفیٰ البابی واولادہ مصر
۳۱	التفہیمات الالہیہ	حضرت شاہ ولی اللہؒ، ۱۱۷۶ھ	مطبع حیدری حیدر آباد، ۱۹۴۲ء
۳۲	رگ وید		ہندوستان
۳۳	قصیدہ بردہ	امام شرف الدین بوصیریؒ	ضیاء القرآن لاہور، ۱۹۹۳ء
۳۴	کلیات اقبال	علامہ محمد اقبالؒ، ۱۹۳۸ء	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۵ء

A- قرآنیات

01) عرفان القرآن (ترجمہ پارہ (1-19،30)
02) عرفان القرآن (ترجمہ پارہ 1-15 جلد)
03) تفسیر منہاج القرآن (سورہ بقرہ)
04) حکمت استعاذہ
05) تسمیۃ القرآن
06) معارف الکوثر
07) فلسفہ تسمیہ
08) معارف اسم اللہ
09) مناہج العرفان فی لفظ القرآن
10) رب العالمین (لفظ رب کے معانی و معارف)
11) صفت رحمت کا شان امتیاز
12) سمائے سورہ فاتحہ
13) سورہ فاتحہ اور تصور ہدایت
14) اسلوب سورہ فاتحہ اور نظام فکر و عمل
15) سورہ فاتحہ اور تعلیمات طریقت
16) سورہ فاتحہ اور انسانی زندگی کا اعتقادی پہلو
17) شان اولیت اور سورہ فاتحہ
18) سورہ فاتحہ اور حیات انسانی کا عملی پہلو (تصور عبادت)
19) سورہ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
20) فطرت کا قرآنی تصور
21) لا اکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ
22) کنزالایمان کی فنی حیثیت

B- ایمانیات

23) ارکان ایمان
24) ایمان اور اسلام
25) شہادت توحید
26) حقیقت توحید و رسالت
27) ایمان بالرسالت
28) ایمان بالکتب
29) ایمان بالقدر
30) ایمان بالآخرت
31) مومن کون ہے؟
32) مناظرہ ڈنمارک

C- الہیات

33) اطاعت الٰہی
34) ذکر الٰہی
35) محبت الٰہی
36) خشیت الٰہی اور اس کے تقاضے

D- اعتقادیات

37) ایصال ثواب اور اس کی شرعی حیثیت
38) عقیدہ توحید اور حقیقت شرک
39) تصور بدعت اور اس کی شرعی حیثیت
40) عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت
41) عقیدہ ختم نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی
42) مرزائے قادیان اور تشریعی نبوت کا دعویٰ

43) مرزائے قادیان کی دماغی کیفیت

44) عقیدہ ختم نبوت اور مرزائے قادیان کا متضاد موقف

45) خوابوں اور بشارات پر اعتراضات کا علمی محاکمہ

46) فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟

47) منافقت اور اس کی علامات

48) سنیت کیا ہے؟

49) منہاج العقائد

50) تصور استغاثت

E- سیرت النبوی ﷺ

51) مقدمہ سیرۃ الرسول ﷺ (جلد اول)

52) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد دوم)

53) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد سوم)

54) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد چہارم)

55) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد پنجم)

56) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد ششم)

57) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد ہفتم)

58) سیرۃ الرسول ﷺ (جلد ہشتم)

59) سیرت نبوی ﷺ کا علمی فیضان

60) سیرت نبوی ﷺ کی تاریخی اہمیت

61) سیرت نبوی ﷺ کی عصری و بین الاقوامی اہمیت

62) قرآن اور سیرت نبوی ﷺ کا نظریاتی و انقلابی فلسفہ

63) نور محمدی خلقت سے ولادت تک (میلاد نامہ)

64) تاریخ مولد النبی ﷺ

65) جشن عید میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت

66) جشن عید میلاد النبی ﷺ ائمہ و محدثین کے اقوال کی روشنی میں

67) حیاۃ النبی ﷺ

68) فلسفہ معراج النبی ﷺ

69) قرآن اور شمائل نبوی ﷺ

70) الاربعین فی فضائل النبی الامین ﷺ

71) معارف اسم محمد ﷺ

72) معارف الشفاء بتعریف حقوق المصطفی ﷺ

73) تحفۃ السرور فی تفسیر آیہ نور

74) نور الابصار بذکر النبی المختار ﷺ

75) تذکار رسالت

76) ذکر مصطفیٰ ﷺ (کائنات کی بلند ترین حقیقت)

77) فضیلت درود و سلام

78) ایمان کا مرکز و محور (ذات مصطفیٰ ﷺ)

79) عشق رسول ﷺ وقت کی اہم ضرورت

80) عشق رسول ﷺ استحکام ایمان کا واحد ذریعہ

81) غلامی رسول حقیقی تقویٰ کی اساس

82) تحفظ ناموس رسالت

F- عبادات

83) ارکان اسلام

84) فلسفہ نماز

85) آداب نماز

86) نماز اور فلسفہ اجتماعیت

87) نماز کا فلسفہ معراج

88) فلسفہ صوم

89) فلسفہ و احکام حج

G- روحانیات

90) حقیقت تصوف (جلد اول)

91) اسلامی تربیتی نصاب (جلد اول)

92) اسلامی تربیتی نصاب (جلد دوم)

93) سلوک و تصوف کا عملی دستور

94) اخلاق الانبیاء

95) تذکرے اور صحبتیں

96) حسن اعمال

97) حسن احوال

98) حسن اخلاق

99) صفائے قلب و باطن

100) فساد قلب اور اس کا علاج

101) زندگی نیکی اور بدی کی جنگ ہے

102) ہر شخص اپنے نشہ عمل میں گرفتار ہے

103) ہم اپنا اصلی وطن بھول چکے ہیں

104) تربیت کا قرآنی منہاج

105) جرم توبہ اور اصلاح احوال

106) طبقات العباد

107) حقیقت اعتکاف

H- فقہیات

108) منہاج المسائل

19) نص اور تعبیر نص

110) تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب

111) اجتہاد اور اس کا دائرہ کار

112) عصر حاضر اور فلسفہ اجتہاد

113) تاریخ فقہ میں ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا مقام

I- تعلیمات

114) اسلام کا تصور علم

115) علم توجیہی یا تخلیقی

116) دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو

117) تعلیمی مسائل پر انٹرویو

J- اقتصادیات

118) معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

119) بلاسود بنکاری کا عبوری خاکہ

120) بلاسود بنکاری اور اسلامی معیشت

121) بجلی مہنگی کیوں؟ IPPS کا معاملہ کیا ہے؟

K- جہادیات

122) حقیقت جہاد

123) جہاد بالمال

124) فلسفہ شہادت امام حسین علیہ السلام

125) شہادت امام حسینؓ (حقائق و واقعات)

126) شہادت امام حسینؓ ایک پیغام

L- فکریات

127) قرآنی فلسفہ انقلاب

128) منہاج الافکار (جلد اول)

129) منہاج الافکار (جلد دوم)

130) منہاج الافکار (جلد سوم)

131) اسلامی فلسفہ زندگی

132) ہمارا دینی زوال اور اسکے تدارک کا سہ جہتی

133) ایمان پر باطل کا سہ جہتی حملہ اور اس کا تدارک

134) دور حاضر میں طاغوتی یلغار کے چار محاذ

135) خدمت دین کی توفیق

136) قرآنی فلسفہ تبلیغ

137) اسلام کا تصور اعتدال و توازن

138) حقوق

139) اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام

140) نوجوان نسل دین سے دور کیوں؟

141) عصر حاضر کے جدید مسائل اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

142) تحریک منہاج القرآن "افکار و ہدایات"

143) تحریک منہاج القرآن انٹرویوز کی روشنی میں

144) تحریک منہاج القرآن کی انقلابی فکر

145) روائتی سیاست یا مصطفوی انقلاب

146) اجتماعی تحریکی کردار کے چار عناصر

147) اہم انٹرویو

M- انقلابیات

148) نظام مصطفیٰ (ایک انقلاب آفریں پیغام)

149) حصول مقصد کی جدو جہد اور نتیجہ خیزی

150) پیغمبرانہ جدو جہد اور اس کے نتائج

151) پیغمبر انقلاب اور صحیفہ انقلاب

152) قرآنی فلسفہ عروج وزوال

153) باطل قوتوں کو کھلا چیلنج

154) سفر انقلاب

155) مصطفوی انقلاب میں طلبہ کا کردار

156) سیرت النبی ﷺ اور انقلابی جدو جہد

N- سیاسیات

157) سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

158) تصور دین اور حیات نبوی ﷺ کا سیاسی پہلو

159) نیو ورلڈ آرڈر اور عالم اسلام

160) آئندہ سیاسی پروگرام

O- قانونیات

161) اسلامی قانون کی بنیادی خصوصیات

162) اسلامی اور مغربی تصور قانون کا تقابلی جائزہ

163) اسلام میں سزائے قید اور جیل کا تصور

P- شخصیات

164) پیکر عشق رسول سیدنا صدیق اکبرؓ

165) فضائل و مراتب سیدنا فاروق اعظمؓ

166) حب علی کرم اللہ وجہہ الکریم

167) سیرت حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ تعالی عنہا

168) سیرت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا

169) سیرت سیدہ عالم فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالی عنہا

170) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفہ خودی

171) حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں (بریلوی) کا علمی نظم

172) اقبال کا خواب اور آج کا پاکستان

173) اقبال اور پیغام عشق رسول ﷺ

174) اقبال اور تصور عشق

175) اقبال کا مرد مومن

Q- سائنسی کتب

176)انسان اور کائنات کی تخلیق وارتقاء

177)امراض قلب سے بچاؤ کی تدابیر

178)شان اولیاء قرآن اور جدید سائنس کی روشنی میں

R- عربی کتب

179)معهد منهاج القرآن

180)التصور الاسلامی لطبيعة البشريه

181)نهج التربية الاجتماعية فی القرآن

182)التصور التشريعي للحكم الاسلامی

183)فلسفة الاجتهاد والعالم المعاصر

184)الجريمة فی الفقه الاسلامی

185)منهاج الخطبات للعيدين و الجمعات

186)قواعد الاقتصاد فی الاسلام

187)الاقتصاد الاربوی والنظام المصر فی الاسلامی

S- انگلش کتب

188)Islamic Philosophy of Human Life

189)Islam in Various Perspectives

190)Islam and Christianity

191)Islam and Criminality

192)Qur'anic Concept of Human Guidance

193)Islamic Concept of Human Nature

194)Devine Pleasure

195)Quranic Philosophy of Benevolence (Ehsan)

196)Islam and Freedom of Human Will

197)Islamic Penal System and Philosophy

198)Islamic Concept of Law

199)Philosophy of Ijtihad and the Modern World

200)Quranic Basis of Constitutional Theory

201)Islam the State Religion

202)Legal Character of Islamic Punishments

203)Legal Structure of Islamic Punishments

204)Classification of Islamic Punishments

205)Islamic Philosophy of Punishments

206)Islamic Concept of Crime

207)Quran on Creation and Expension of the Universe

208)Creation and Evolution of the Universe

209)Creation of Man

210)Islam on prevention of Heart Diseases